Preface to Short Stories

Thirty years ago, during the mid-seventies, when I was studying law in Pakistan, I wrote two books of short stories. They were called *Ghantian* and *Ghunghru*. Together, they may be called *The Bells*. I was in my twenties and at the time I was introduced to English, Urdu, and Punjabi literature. I was also part of the young intellectual community of Lahore. We would gather in the American Council located near Fatima Jinnah Medical School. Friends would sit in the café below the Council's library and talk literature, world affairs, and politics. Many of these friends later joined the federal government; others were engineers most of whom who eventually migrated to America. The Bells emerged from intellectual experiences closely associated with the American Council.

The Bells are stories of relationships. Written in complex metaphorical and hidden language, each story traces the origin of a unique relationship that suffers from a disconnect between surface and reality. Each story produces a moment of surprise or mild shock. The slumber ends and the person is jolted into reality. This moment of *kashf* (revelation) is a bell. The bell rings to awaken the reader from a conventional understanding of the relationship narrated in the story. I don't know to what extent do I succeed in ringing this bell for the readers.

Some friends in Pakistan had the original copies. Maybe, some in the US do too. I am not sure if they still have them. I myself brought a couple of copies to the United States. I was so afraid to lose them that I framed a couple of them and hung them in my house. Fearful that they would be lost forever, I requested Martin Wisneski to digitize them and preserve them in the Washburn University archives. I thank him for doing this favor to me. I also appreciate the assistance of Jennifer Tabuas with scanning *Ghunghru*.

Hopefully, someone would take the time to translate them into English. Due to their unique metaphorical contents, it is highly unlikely that translations would reproduce the frigid passion of these stories. But those who can read Urdu will have more to say about the bells.

Liaquat Ali Khan
Washburn University
Topeka, Kansas
June 8, 2006.

P.S. In Pakistan and New York, many friends called me Naz. It was customary to give yourself a name to express your poetic self-image. I believe I chose the name Naz when I was six or seven years old and kept it during my adult years. I dropped this acquired name when I came to Topeka and officially when I became a US citizen. Many old friends, including Professors John Delaney and Mark Stavsky, still call me Naz. Professor Hisham Ramadan calls me Abu Kashif, a name I now like.

گفتگو

علامتی افسانے

لیاقت ع۔ ناز

گھنگھرو

لیاقت ع ناز
بی - ایس - سی (انجنیئرنگ) ایم اے (انگریزی)

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

پبلشرز ـــــــــ طارق پبلشرز
۲۴۴/اے جی ٹی روڈ لاہور
پرنٹرز ـــــــــ فرینڈز آرٹ پریس لاہور
قیمت ـــــــــ ۲/۵۰ روپے
تعداد اشاعت ـــــــــ ۵۰۰
کتابت ـــــــــ اللہ دتا
سال ـــــــــ جنوری ۱۹۷۵ء

انگریز چھٹی لڑکی ——— جولین کے نام

جو بہت ذہین تھی ——— اور خوبصورت بھی !

گھنگھرو عورت باندھے تو طوائف
گھنگھرو مرد پہنے تو ملنگ
چاہو تو انسان کھو دو
چاہو تو خُدا پا لو
گھنگھرو صرف گھنگھرو ہے۔

گھنگھرو جذبات کی چُپ میں بجتا ہے۔

وہ معنی بکھیرتا ہُوا بھی بے معنی ہے۔

اس میں جذبات کا شور بھی ہے!

اور جذبات کا سکوت بھی!

فہرس

گھنگھرو (نظم) ـــــــــ ۱۳
زاویے ـــــــــ ۱۷
۱۔ پرزے ـــــــــ ۲۵
۲۔ بنتو ـــــــــ ۲۸
۳۔ ربڑ کی گھوڑی ـــــــــ ۳۲
۴۔ پچھڑے ـــــــــ ۳۶
۵۔ گجرو ـــــــــ ۴۳
۶۔ موتی ـــــــــ ۴۷
۷۔ گھنگھرو ـــــــــ ۵۲
۸۔ کھرنڈ ـــــــــ ۶۳
۹۔ رت جگے ـــــــــ ۶۸
۱۰۔ کٹھ پتلی ـــــــــ ۷۳
۱۱۔ جگنوؤں کی طرح ـــــــــ ۷۷
۱۲۔ توبہ کا پتھر ـــــــــ ۸۱

گھنگھرو

پیپل کے پتوں کی پت جھڑ کے نیچے
کانپتے سُرخ کانوں سے سُورج ڈھلے
اُسی شام کے دھندلکوں سے اُٹھیں
رت جگے ۔ رت جگے ۔ جھلملاتے ہوئے
چوڑیوں کی چھنک
ناچنے کی کھنک
برتنوں کی طرح

برتنوں کی طرح
جسم سجتے ہُوئے
ہاتھ ملتے ہُوئے
بازوؤں میں گریں
جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے ہوئے
ٹمٹماتے ہوئے جگنوؤں کی طرح

دل کے مندر میں بجتی رہیں گھنٹیاں

گھنٹیاں :

رات سوتی رہے
آنکھ روتی رہے
گھنگھروؤں کی طرح کھنکھناتے ہوئے ۔
کھنکھناتے ہوئے گھنگھروؤں کی طرح !

تب جا کر کہیں
شبنمی شبنمی
رات کی کوکھ سے
یہ سویرا کھلے !

یہ سویرا کھلے
سم سموں کی طرح ۔ سم سموں کی طرح
پیپل کی شاخوں پہ گاتے ہُوئے
منچلوں کی طرح ۔ منچلوں کی طرح

منچلوں کی طرح
مسجدوں سے اُٹھیں

مسجدوں سے اُٹھیں
ورد کرتے ہوئے
خود سے ڈرتے ہوئے
کارواں یہ چلے
کارواں یہ چلے
کارواں یہ چلے
توبہ!

لیاقت علی ناز

زاویے

نازکی کتاب انسانی رشتوں کی کہانی ہے۔ انسان رشتوں کا کیوں محتاج ہے؟ یہ رشتے کس طرح بنتے ہیں؟ کیوں اور کیسے ٹوٹ جاتے ہیں؟ انسانی رشتے کتنی قسم کے ہوتے ہیں؟ یہ اور ایسے ہی کئی اور مسائل ہیں جن کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمام انسانی رشتوں کی بُنیاد وہ خوف ہے جو تنہائی سے جنم لیتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہی تنہائی کے خون کا مداوا ہے۔ جب کوئی شخص پوری کائنات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے تو شاید وہ خود سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔ ان لمحات میں اُس کی حالت ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی ہوتی ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ تنکے کا سہارا بھی خوب ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے لئے ایک غیر حقیقی لمحاتی اور کھوکھلا رشتہ بھی قابلِ قبول ہوتا ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ "پرزے" بھی انہی لمحات کی کہانی ہے۔ بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی پر جب اپنی حیات کا کھوکھلا پن واضح ہوتا ہے۔ تو اُسے اپنی آواز سے بھی اپنا رشتہ ٹوٹتا ہُوا نظر آتا ہے اور وہ اپنی تنہائی

سے خوفزدہ ہو کر کرسی میں بیٹھے ہوئے اُس شخص کو پکارتی ہے جو زندگی کے ادھورے پن کے درد میں مبتلا ہے۔ رشتوں کا خلا ہی رشتوں کو جنم دیتا ہے۔

خوف کے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے بعض اوقات انسان اپنی ساری توجہ جانوروں پر مرکوز کر دیتا ہے۔ چوسر کی راھبہ کی طرح وہ کوئی نہ کوئی جانور پال کر اپنا سارا پیار اور جذبائیت اس سے وابستہ کر دیتا ہے۔ وہ اس پالتو جانور کے لیے جو کچھ محسوس کرتا ہے۔ شاید اسی شدّت کے ساتھ اس کا صلہ بھی چاہتا ہے۔ یہی انسان کی بھول ہے۔ جانور اور انسان کا رشتہ ایک حد کے بعد غیر فطری اور غیر حقیقی رشتہ بن جاتا ہے

"بنتو" میں ایک ایسے ہی رشتے کا المیہ دکھانا مقصود ہے۔ بنتو اور عمرو دو ایسی اکائیاں ہیں جو اکٹھی تو ہو سکتی ہیں ایک دوسرے میں ڈھل نہیں سکتیں۔ ان میں موجود تضادات اتنے گہرے ہیں کہ ایک ابدی رشتہ محض ایک سپنا ہے کیونکہ بنتو ہمیشہ، بندریا ہی رہے گی۔ کبھی انسان نہیں بن سکتی۔ ایک حقیقی رشتہ صرف دو انسانوں کے درمیان ہی تعمیر ہو سکتا ہے۔

رشتوں کا یہ سراب بنتو تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ہمیں زندگی کے سفر میں بارہا دکھائی دیتا ہے انسانوں میں موجود بیشتر رشتے ایسی ہی نوعیت کے حامل ہیں۔ دور سے یہ سراب ایک حقیقی نخلستان کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس میں تسکین کا ہر سامان موجود ہے لیکن قریب پہنچ کر یہ المیہ کھلتا ہے

کہ اس کی حقیقت تو محض ریت کے اس محل کی مانند تھی جو ہوا کے ایک ھی تھپیڑے سے ریت ریت ہو جاتا ھے۔ رشتوں کا یہ کھوکھلا پن اس کتاب کے بیشتر افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مختلف افسانوں میں ان وجوھات کو تلاش کیا گیا ھے۔ جن کی وجہ سے انسانی رشتوں میں چور دروازے پیدا ہوتے ہیں۔ "ربڑ کی گھوڑی" میں ایک ماں اور اُس کی معصوم بچّی کے درمیان ایک ایسا رشتہ بنتا نظر آتا ھے۔ جس کی بنیاد گناہوں کی دلدل میں ہے۔ بچی کی نفرت ایک ایسے شخص سے ھے جو انسانوں کو کھلونوں کی طرح بیچتا ہے۔ نفرت کی یہ حقیقت بچّی کی محبت کی حقیقت سے مل کر ایک ایسے المیے کو جنم دیتی ہے جس سے ھر قاری ایک رُوح میں پیوست ہو جانے والے کھوکھلے رشتے سے روشناس ہوتا ہے

"چھیچھڑے" بھی انھی افسانوں کی ایک کڑی ہے۔ اس افسانے کی خاتون دو رشتوں میں بندھی ہے۔ پہلی قسم کا رشتہ جو اُس کا اپنے، شوھر کے ساتھ ہے محض جبلی تقاضوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس میں جسم تو ملتے ہیں ذھنوں کی ملاقات نھیں ہوتی۔

اس خاتون کا دوسرا رشتہ جہاز میں ملنے والے ندیم سے بنتا ہے۔ اس رشتے میں ذھنوں کی ہم آھنگی تو ہے لیکن جبلی تقاضے ادھورے رھتے ہیں۔ یہی المیہ دیر یا سویر ہر اُس شخص کو پیش آتا ھے جو ذھن اور جسم دونوں کی ضرورتوں کو مدّ نظر نھیں رکھتا ایک حقیقی رشتہ جسم اور ذھن دونوں کے امتزاج سے بنتا ھے اور یہی وہ منزل ہے جس کی طرف ھر کارواں رواں دواں ھے لیکن اس رشتے کا حصول ایک خواب کو حقیقت میں بدلنے

کی آرزو ہے جس کی، چاہت کی وجہ سے بہت سارے زندہ المیے بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

اس کے برعکس رشتوں کے کچھ المیے معاشرے کی غیر حقیقی قدروں نے بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ کیونکہ انھی کھوکھلی اقدار کی وجہ سے انسان اور انسان کے درمیان نفرت کا ایک ایسا رشتہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جس کی بنیادیں سراسر معاشرے کی معاشی بنیادوں پر ہیں۔

"گجرو" میں گجرو کی خوشی قدرتی ہے کیونکہ اس کی بیٹیاں پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گی۔ دوسری طرف غم بھی ایک فطری حقیقت ہے۔ ناز کے اپنے لفظوں میں معاشرے کی معاشی کھینچا تانی کی وجہ سے محبت کے رشتے نفرت کی لو پر پگھلتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے لئے ہم سب ذمہ دار ہیں اس لئے گجرو کی بیٹیوں کی بھوک ہمارے وجہ سے ہے!

حقیقی بنیادوں پر بنے ہوئے رشتے ایک دوسرے کی ہمدردی پر استوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اس معاشرے کے دیئے ہوئے تمام غیر حقیقی رشتوں کا عادی ہو کر انہیں جاننے بھی لگتا ہے تو اسے سارے رشتے ہی کھوکھلے نظر آنے لگتے ہیں۔ تب وہ شخص "موتی" کا "قاسم بھٹی" بن جاتا ہے۔ "موتی" افسانے کے تمام کردار قاسم بھٹی کے حوالے سے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس کی زندگی کی بنیادیں غیر حقیقی سچائیوں پر رکھی گئی ہیں۔ اس لیے اسے ہر رشتہ کھوکھلا اور ہر شخص غیر سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ المیہ بھی آج چاروں طرف پھیلا ہوا ہے یہ بھی آج کے ہمارے ہی معاشرے کی دین ہے۔

افسانہ "گھنگھرو" ناز کے اپنے لفظوں میں جذبات کی چُپ کا رشتہ ہے ڈاکٹر ظفری انجانے نفسیاتی وجوہات کی بنا پر احساسات کا وہ گلیشیر ہے جس نے اپنے جذبات کو اپنے پیشے کی حدّت میں تبدیل کر دیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس میں ڈاکٹر ظفری ایک روحانی رشتے کی اُمید رکھتا ہے چونکہ اس میں ظفری کو وہ سارے نشانات دکھائی دیتے ہیں جو "بہرِ بحیرہ" والی خاتون میں منتشر ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ظفری اپنی ساری تنقیدی بصیرت کے باوجود ایک ایسے پہلو سے بے خبر ہے جو درحقیقت اُس کے جذباتی المیے کا سبب ہے اور وہ ہے دوسرے شخص کی شعوری ترجیح۔ شعور کے وہ محرکات جو ایک شخص کے لیے انتہائی معنی خیز ہوتے ہیں دوسرے شخص کے لیے محض "شعور کا اندھاپن" ہوتا ہے۔ جیساکہ ڈاکٹر ظفری محبت کو عقیدت کا وہ چراغ سمجھتی ہے جو مُردے کی ہڈیوں پر جلائے جاتے ہیں۔

یہی المیہ ہر گھنگھرو کا المیہ ہے۔ کیونکہ "گھنگھرو جذبات کی چُپ میں بجتا ہے وہ معنی بکھیرتا ہوا بھی بے معنی ہے۔ کیونکہ اس میں جذبات کا شور بھی ہے اور جذبات کا سکوت بھی" اور اسی وجہ سے اس کتاب کا نام بھی ناز نے گھنگھرو ہی رکھا ہے۔ گھنگھرو کھوکھلے جذبات کے شور کا بہترین سمبل ہے جو بے شمار المیے پیدا کرتا ہے۔

ایسے ہی المیے انسان کے لیے ایک حقیقی رشتے کی بنیاد ڈالتے ہیں اور یہ رشتہ ہے انسان اور درد کا رشتہ۔ درد کا یہ رشتہ ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔ کبھی یہ "کھرنڈ" میں جولین کی شکل میں اور کبھی چائے

بنانے والے بوڑھے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ رِستے ہوئے زخموں پر کبھی کبھار کھُرنڈ ضرور جم جاتا ہے۔ لیکن انسان خود ہی (انجانے میں یا نیند میں اپنے ہی ناخنوں سے اِس کھُرنڈ کو چھیل دیتا ہے اور درد کا رشتہ دوبارہ استوار ہو جاتا ہے۔ اور شاید درد کے اسی رشتے کی بدولت انسان کا اپنی ذات سے رشتہ قائم و دائم ہے۔

خود سے انسان کا رشتہ کئی شکلوں میں کئی انسانوں میں نظر آتا ہے دوسرے رشتوں کی طرح یہ رشتہ کھوکھلا بھی ہو سکتا ہے اور حقیقی بھی "رت جگے" میں نصیب کو جب اپنے کھوکھلے رشتہ کا شعور ہوتا ہے تو وہ نظری تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ تناؤ خود کو پہچاننے سے انکار کا تناؤ ہے یہ اس احساس کا تناؤ ہے جو ایک ہوائی رشتے کو درد اور شرمندگی میں تبدیل کرتا ہے۔ ایسا درد اور شرمندگی جس سے انسان اپنی ذات سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت "کٹھ پُتلی" کی طوائف خود اپنے وجود کو مٹا ڈالتی ہے۔ یہ المیہ بھی اسی غیر حقیقی رشتے کی وجہ سے وجود میں آیا ہے جو برسوں سے نگو نے اپنے گرد بُنا ہوا ہے۔ دراصل ہر غیر حقیقی رشتہ بے معنویت کے جال میں ٹوٹتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جب انسان اپنے آپ کو پہچان کر اپنی ہوش کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی کام کرتا ہے یا کسی بڑے کام کا بیڑا اُٹھاتا ہے تو اس سے نہ صرف معاشرے کا بھلا ہوتا ہے بلکہ خود اس کا "اپنا پن" برقرار رہتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے ایسا شخص بھی اپنے وجود کو مٹا ڈالے۔ لیکن یہ موت نگو کی خودکشی نہیں، حسین کی قربانی ہو گی۔

اپنی ذات سے اتنا مضبوط رشتہ ہر شخص کی بساط سے باہر ہے عموماً ہر شخص اپنی ذات کے "ناکافی ہونے" کے احساس کی وجہ سے ایک ایسی طاقت سے اپنا رشتہ استوار کر لیتا ہے جو ساری طاقتوں کا منبع ہے اور یہ ہے خدا سے رشتہ ۔ لیکن "توبہ کا پتھر" میں ماں پر جب یہ بات کھلتی ہے کہ انسان اپنے دوزخ میں خود ہی جلتا ہے تو اُسے یہ اہم رشتہ بھی ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے اور اس آخری سہارے کے ٹوٹنے سے جو المیہ جنم لیتا ہے وہ ہے نازکا وہ ابتدائیہ جس میں اُس کی نظم اس درد سے ختم ہوتی ہے کہ

کارواں یہ چلے ——————
کارواں یہ چلے ——————
توبہ ——————

شاہد لبشیر

پُرزے

احساس تنہائی کی شدت حیات کو پُرزے پُرزے
کر دیتی ہے۔

ایوبیہ کی برفیلی پہاڑیوں پر واقع ہوٹل

کا کمرہ نمبر دو آج رات ایک ایسا پتھر ملا قفس ہے جس میں خواہش اور مجبوری کے ناخداؤں نے ایک معاہدے کی رُو سے دو عجیب و غریب انسانوں کو بند کر دیا ہو۔

سنگل بیڈ پر بچھی سلوٹوں سے مبرّا سفید رنگ کی بے داغ چادر پر ایک چودہ سال کی خوبصورت لڑکی لیٹی ہے۔ جسکی پیاری سی ناک میں سونے کی چھوٹی سی گول نتھنی جھول رہی ہے۔

کمرے میں موجود دوسرا شخص کرسی میں یوں دھنس کر بیٹھا ہے۔ جیسے اُس کی ساری حیات کو نیچے لڑھک جانے سے صرف کرسی کے بازوؤں نے روک رکھا ہو۔ اُس کی آنکھیں اُس کے ہونٹ اور اُس کی قوت لمس ضمیر کے گہرے نیلے پانیوں میں ڈوب چکی ہے اور اور اس کا باقی وجود تیز کے پَر کی طرح دو یا تین رنگوں کے گول گول دائروں میں منقسم ہو چکا ہے اُسے اس رُوپ میں پاکر ہر دیکھنے والے کے ذہن میں یہی ایک سوال اُبھرے گا ــــ کیا یہ زندہ ہے۔؟

کمرے کے آمنے سامنے والے دروازے۔ آمنے سامنے والی کھڑکیاں۔ اور آمنے سامنے والے روشن دان بھینچ کر بند ہیں۔ کمرے کی فضا کو محسوس کر کے یوں لگتا ہے۔ جیسے خاموشی کی گہری جھیل پر تنہائی کی تاریک رات چھائی ہو۔

کمرے کی فضا میں رچے ہوئے سناٹے سے خوفزدہ ہو کر لڑکی نے گنگنانا شروع کر دیا ہے لیکن تھوڑی دیر گنگنانے کے بعد لڑکی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اب اس کی گنگناہٹ میں بھی وہی خوفناک سناٹا پھیلتا جا رہا ہے۔ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

ایک ایسا سناٹا جو معنویت کے سارے دھاگے توڑ کر حیات کی کٹھ پتلی کو ان گنت پرزوں میں علیحدہ علیحدہ کر دیتا ہے۔ گتے کے ان بے شمار ٹکڑوں کی طرح جنہیں کوئی ذہین بچہ اس طرح ترتیب دے کہ وہ کوئی جانور بن جائے ــــ اس پھیلتے ہوئے سناٹے

سے خوفزدہ ہو کر لڑکی نے کرسی میں دھنسے ہوئے شخص کو پکارا۔

"اجنبی۔ خدا کے لئے میرے قریب آؤ"

بنتو

انسان تو جانور ہے مگر کیا جانور بھی انسان ہوتے ہیں!
اور شاید اسی لئے انسانی رشتوں سے مکمل فرار
صرف ایک جانور ہی کے لئے ممکن ہے۔

عمرو نے کمرے کا دروازے کھولا تو

بندریا میز سے پھلانگتے ہوئے اُس کے گلے آ لپٹی اپنے دانتوں کو مسوڑھوں سمیت دکھاتے ہوئے شائد وہ مسکرا کر یہ کہنا چاہتی تھی۔

"تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ فیکٹری سے چھٹی ہوتے ہی سیدھے گھر لوٹ آتے ہو۔ کتنے اچھے ہو تم۔"

بندریا کا گال تھپکاتے ہوئے عمرو نے اپنی کوٹ کی جیب سے 'ملوکوں' کا لفافہ نکالا تو بندریا کے پاؤں میں جیسے گھنگھرو بندھ گئے ہوں۔ وہ جسم کے ریشوں میں بجنے والے ستار کی دُھن پر ناچ رہی تھی۔ اپنے لچکدار بدن کو ہوا میں جھولتے ہوئے جب وہ میز پر جا بیٹھی تو عمرو نے 'ملوکوں' کو پلیٹ میں انڈیل کر کے بندریا کے سامنے رکھ دیا۔

اب وہ بڑے مزے لے کر 'ملوک' چبا رہی تھی۔

عمرو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنی بنتو کے لئے کوئی سپیشل چیز لاتا ہے وہ غصے میں ہو یا پیار میں وہ ہمیشہ بندریا کو بنتو ہی کے نام سے پکارتا ہے۔

عمرو اور بنتو پچھلے کئی سالوں سے اکٹھے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عمرو کو صبح ٹھیک وقت پر جگانے کی ذمہ داری بنتو نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ وہ ہر صبح ٹھیک چھ بجے عمرو کو کاندھے سے پکڑ کر اتنی دیر ہلاتی رہتی ہے۔ جب تک کہ عمرو جاگ نہ جائے ـــــ دونوں اکٹھا ناشتہ کرتے ہیں۔ فیکٹری جاتے ہوئے عمرو بنتو کو گھر میں بند کر جاتا ہے ـــــ ٹھیک دو بجے جب عمرو واپس گھر پہنچتا ہے تو بنتو اُس کے گلے ملتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔ چند ہی لمحوں بعد عمرو کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی ساری تھکاوٹ جسم سے خارج ہو گئی ہے ـــــ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد عمرو گھر کا کام کاج کرتا ہے تو بنتو اپنی لیاقت کے مطابق اُس کا ہاتھ بٹاتی ہے ـــــ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں سیر کے لئے نکل جاتے ہیں ـــــ بنتو عمرو کے کاندھے پر بیٹھی ہر راہی سے چھیڑ چھاڑ

کرتی ہے۔ اور عمرو اپنی سوچوں میں کھویا کھویا کوئی اداس گیت بڑبڑاتا چلتا رہتا ہے چلتا رہتا ہے۔

سیر سے واپس لوٹ کر عمرو پڑھائی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ میز پر لگے ہوئے کتابوں کے ڈھیر سے عمرو جب کوئی کتاب اُٹھاتا ہے تو یکدم بنتو بور ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اب عمرو نہ اس سے باتیں کرے گا۔ نہ اُسے اپنے پاس آنے دے گا۔ وہ عمرو کو مظلوم نظروں سے گھورتی ہوئی پلنگ کی پائنتی پر جا لیٹتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے عمرو کتاب سے اِک مِک ہو جاتا ہے تو بنتو اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہو کر آنکھیں موند لیتی ہے عمرو سمجھتا ہے کہ بنتو سو گئی ہے ـــــ کافی رات گئے جب وہ کتاب سے فارغ ہوتا تو بنتو واقعی سو چکی ہوتی۔

پلنگ کی پائنتی پر لیٹی ہوئی بنتو بہت ہی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ معصوم گوشت کا وہ لوتھڑا جس میں نفرت۔ مکاری یا شیطنیت کی کوئی ہڈی نہ ہو۔

آج صبح جب وہ فیکٹری روانہ ہوا تو اُسے ہلکا ہلکا بخار سا تھا۔ عمرو نے سوچا رات کو دیر سے سونے کی تھکاوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ فیکٹری پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد ہی اس کا سارا جسم مٹی کے کچے گھڑے کی طرح ٹوٹنے لگا۔ مشین پر کام کرتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام تیز چلنے والے پُرزوں کا ارتعاش اُس کے دماغ میں منتقل ہو گیا ہے۔ اُس کے سر میں زور زور سے چیخ چیخ کی آواز مسلسل پھٹ رہی تھی۔ اُس کے پاؤں ڈگمگانے لگے تو ساتھ کام کرنے والے مکینک نے گھر جانے کا مشورہ دیا۔ عمرو نے فوریمن سے چھٹی لی اور گھر لوٹ آیا۔

آج پہلا موقعہ تھا کہ وہ دو بجے سے بہت پہلے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ راہ چلتے وہ بنتو سے ہی متعلق سوچ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ کاش اس وقت بنتو اُس کے کاندھے پر بیٹھی اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔

———— عمرو نے کمرے کا دروازہ کھولا تو بنتو غائب تھی !
اس نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر بنتو جیسے کبھی تھی ہی نہیں ! —— پلنگ کے نیچے الماری کے اوپر۔ نہیں وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

عمرو کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہ صبح بنتو کو ٹھیک سے کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔ کمرے کے دروازے۔ کھڑکیاں سب بند ہیں۔

عمرو نے سوچا شاید بنتو کتابوں کے پیچھے چھپی ہے۔ مگر نہیں کتابوں کے پیچھے پھر کتابیں تھیں۔

کتابوں کے ڈھیر کو دوبارہ دیکھتے ہوئے عمرو کو یوں لگا جیسے بنتو کتابوں کے نیچے چھپی ہے مگر نہیں کتابوں کے نیچے پھر کتابیں تھیں۔ اب اس کے ذہن میں بہت عجیب وغریب خیال اُبھرنے لگا۔ اس نے سوچا شاید بنتو کسی ایک کتاب کے صفحوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی سوچ۔ اپنی حالت اور خود اپنے آپ پر رحم سا آنے لگا۔

وہ تھک ہار کر پلنگ پر لیٹا تو اچانک اُس کے دماغ کا ارتعاش ایک زوردار دھماکے سے چپ میں تحلیل ہو گیا —— کمرے کا روشندان کھلا تھا ! ————

ربڑ کی گھوڑی

بچّی نے کہا — ”میں تو انسان ہوں مگر شاید
میری ماں جانور ہے اور باپ تو تھا ہی جانور!“

ماں کی گود میں بیٹھی گوگی بہت خوش تھی

ماں بیٹی کے گلابی گالوں کو بار بار چومتی تو گوگی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ ماں کے گلے میں بانہیں ڈالے گوگی پھر اپنی فرمائش دوہرا رہی تھی۔

"ماں تجھے میں نے کئی بار کہا ہے۔ مجھے ربڑ کی گھوڑی خرید دو۔ لے دو نا ——

گوگی نے ماں کا گال چومتے ہوئے کہا۔

ہاں بیٹی اب بازار چلیں گے نا۔ تو لے دوں گی۔ ماں نے پیار سے کہا۔

بس روز یونہی ٹال دیتی ہو۔ اب لے بھی دو نا۔

کہہ جو دیا بیٹی۔ لے دوں گی —— چلو جاؤ اپنے کمرے میں — جاؤ میری بیٹی۔

—شاباش"، ماں نے گوگی کو اپنی گود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

گوگی کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ ماں کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ لیکن چونکہ وہ ماں کے پیار کے ساتھ ساتھ اُس کے غصّے سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے چپ چاپ دانتوں میں انگلیاں دبائے وہ ننھے ننھے قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

گوگی بہت ہی پیاری بچی ہے۔ قدرت نے اس کے خوبصورت چہرے کو اس قدر معصومیت میں بھگو کے بنایا ہے کہ ہر دیکھنے والا اُسے پلکوں پہ بٹھانا چاہتا ہے۔ محلّے کے سارے لوگ گوگی سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر گوگی نے الماری سے لال گڑیا نکالی اور اس کا منہ چومتے ہوئے پلنگ پر جا لیٹی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جیسے وہ اُداس ہو گئی ہو۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ماں کی گود میں لیٹی لیٹی سو جائے۔

گڑیا کو سینے سے لگائے وہ پلنگ سے اُٹھی اور ماں کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔

ماں کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ بند دروازے کے سامنے کافی دیر خاموش کھڑی

رہی۔ اُس کا جی چاہا کہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹائے لیکن جانے کونسے خوف نے اس کے بازوؤں کی طاقت کو سلب کر دیا تھا۔

خوف اور خواہش کا بے جان مجسمہ بنی وہ اپنے کمرے کی طرف واپس لوٹ رہی تھی کہ برآمدے میں بلی اور بلّی کے بچے کو دیکھتے ہی رُک گئی۔ بلّی ایک کونے میں دبکی اپنے ننھے سے بچے کو دُودھ پلا رہی تھی۔ وہ کافی دیر پھٹے پھٹے دیدوں سے بلّی کے خوبصورت بچّے کو تکتی رہی۔

"انگور کھاؤ گی گوگی بیٹی۔" فضلو نے لفافے سے انگور کا گچھا نکالتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔" گوگی فضلو سے ہمیشہ ترش لہجے میں بات کرتی ہے۔ گوگی کو فضلو سے شدید نفرت ہے۔ شاید فضلو کے چہرے سے گوگی کو فضلو وہ بدصورت بھوت لگتا ہے۔ جو خوبصورت پریوں کو اپنے چنگل میں دبوچ کر دور جیتوں کے جنگل میں چھوڑ آتا ہے۔

فضلو۔ وہ دیکھو فضلو۔ کتے کو مارو نا۔ ایسے ہی بلّی کو تنگ کر رہا ہے۔"

گوگی نے چیختے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں کہتا تمہاری بلّی کو۔ بس یونہی سر پر آسمان اُٹھا لیتی ہو۔" فضلو نے انگور کے لفافے کو الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ کتا تو بلّی کی حفاظت کرتا ہے میری گوگی رانی۔" فضلو نے گوگی کو اپنی بانہوں میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

مجھے نیچے اتارو نا ——— میں نے سو بار کہا ہے مجھے مت اُٹھایا کرو۔"

فضلو نے گوگی کو چومنا چاہا تو گوگی نے فضلو کے منہ پر دو تین تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

فضلو کتے۔ اتارو نا مجھے!

گوگی کا غصہ دیکھتے ہوئے فضلو نے اُسے زمین پر اُتار دیا۔ وہ دِل ہی دِل میں کہہ رہا تھا۔ ٹھیک ہو جاؤ گی گوگی رانی۔

وہ اپنے کمرے کی طرف واپس لوٹ رہی تھی کہ اُسے ماں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ماں کو دیکھتے ہی گوگی اُس کی ٹانگوں سے جا لپٹی۔

ماں مجھے گود میں اُٹھا لو نا۔ گوگی نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

ماں نے گوگی کو اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے اُس کی پرنم آنکھوں کو مسلسل چوما تو گوگی جیسے کبھی اُداس ہی نہ تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

اپنی ماں کی آنکھوں میں تکتے ہوئے اُس نے کہا۔ "ماں مجھے فضلو اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں میری بیٹی۔ فضلو تو تجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔

"نہیں ماں وہ جب بھی آتا ہے اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ہی لیکر آتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا بیٹی۔ تجھے کیا کہتے ہیں وہ آدمی؟"

"مجھے تو کچھ نہیں کہتے ماں۔ لیکن پھر تم تو اپنا دروازہ بند کر لیتی ہو نا ـــــ یہ کون لوگ ہیں ماں؟ یہ روز کیا کرنے آتے ہیں؟ بتاؤ نا۔"

"تو نہیں سمجھے گی بیٹی تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"نہیں ماں بتاؤ! تم میرے کمرے میں کیوں نہیں رہتی۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ ماں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"فضلو ـــــ فضلو گوگی کو بازار لے جاؤ اور اسے ربڑ کی گھوڑی خرید دو۔"

"نہیں ماں۔ میں فضلو کے ساتھ بازار نہیں جاؤں گی۔"

ماں اور فضلو کو برآمدے میں چھوڑ کر گوگی چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چھیچھڑے

جسم ذہن کے بغیر اور ذہن جسم کے بغیر شکستہ
سازوں کی مانند ہیں۔ رُوح کی دُھن جسم اور
ذہن کے اجتماعی آرکسٹرا سے مرتب ہوتی ہے۔

جہاز اُڑنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے

اور ابھی تک ندیم کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ ندیم بڑی بے چینی سے اس لڑکی کا انتظار کر رہا تھا جسے اُس کے ساتھ طویل سفر کرنا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ہمسفری بھی کتنا عجیب رشتہ ہے۔ سفر لمبا ہو تو جی چاہتا ہے کہ کوئی اچھا سا ہمسفر مل جائے ..... اور اگر ہمسفر اچھا ہو تو جی چاہتا ہے سفر ختم ہی نہ ہو۔

ہمسفر ـــــ ایک ایسا شخص جو اتفاقاً ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھتا ہے۔

ندیم ایک سوچنے والا شخص ہے۔

وہ سوچتا ہے ـــ زندگی کے اس آوارہ دریا سے متعلق جو جہاں جی چاہتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے اپنی دیوانگی کا رُخ تبدیل کر لیتا ہے۔ بن پوچھے ان لوگوں کے جو اُس کے پانی تلے روندے جاتے ہیں یا بن پوچھے ان لوگوں کے جن کے چھاگل خشک ہو جاتے ہیں ـــ وہ تو اپنے من میں جھومتا، اپنی قوت کی باگیں ڈھیلی چھوڑے چاہے تو مڑتا ہی چلا جاتا ہے اور چاہے تو مڑتا ہی نہیں ـــ لیکن پھر وہ یہ بھی تو سوچتا ہے کہ زندگی کو محض ایک آوارہ دریا سے تعبیر کرنا زندگی کو ایک ہی معنی میں بند کرنے کے مترادف ہے ـــ زندگی کا مفہوم کسی ایک سانچے میں نہیں ڈھل سکتا ـــ زندگی کا لفظ بذاتِ خود ایک آوارہ دریا ہے۔ جو جہاں جی چاہتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے۔ اپنے مفہوم کا رُخ بدل لیتا ہے۔ تاریخ کی اِن تمام سوچوں میں شگاف ڈالتے ہوئے جنہوں نے اس دریا کو مٹی کے بڑے بڑے تودوں سے گھیرے میں لینے کی کوشش کی تھی۔

ندیم سوچ کی انہیں لہروں پر تھپیڑے کھا رہا تھا۔ کہ اس نے محسوس کیا کہ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی خاتون آ بیٹھی ہے۔

ندیم اپنے ہمسفر کا بغور جائزہ لینا ہی چاہتا تھا کہ جہاز کے شور نے اُس خواہش کو چند لمحوں

کے لئے منتشر کر دیا ۔ وہ سوچنے لگا جہاز زمین سے اُٹھتا ہے ۔ کہ جہاں سے اُٹھتا ہے۔

جہاز کا شور تھا تو ندیم نے اپنے ہمسفر کو غور سے دیکھا ۔ لمبے لمبے بالوں والی ایک ایسی خاتون جس کے چہرے پر جوانی کی دھوپ بھی تھی ۔ اُداسی کی چھاؤں بھی ۔ خون کی سرخی بھی تھی ۔ سوچ کی پیلاہٹ بھی ۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں بھی ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ دائرے بھی ۔

کیا آپ بھی نیویارک جا رہے ہیں" خاتون نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا ۔

"جی ہاں ۔ تو گویا آپ بھی ـــــ"

"ہاں مجھے نیویارک بہت پسند ہے ۔ بہت خوبصورت ہے ۔ بہت خوبصورت میڈم ۔ خوبصورتی تو آنکھ کا ذائقہ ہے بدلتا رہتا ہے ۔ مجھے تو نیویارک سے زیادہ اپنا لاہور خوبصورت لگتا ہے ۔ ندیم نے بات کو ایک نیا روپ دیتے ہوئے کہا ۔

"بہت خوب ۔ چلیئے یونہی سہی ۔ لیکن پھر اس لحاظ سے تو میرا آبائی گاؤں دنیا کی خوبصورت ترین جگہ ہے" خاتون نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ۔

"بالکل ٹھیک ! میرے نزدیک خوبصورتی چاہت کے بندھن کا نام ہے" ندیم نے اپنی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ پر رکھتے ہوئے کہا ۔

"خوبصورتی بندھن کی چاہت ہے یا چاہت کا بندھن ـــ یہ تو ہوئی لفظوں کی آنکھ مچولی ۔ بہرحال آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں ۔" خاتون نے سگریٹ کا کثیف دھواں چھوڑتے ہوئے کہا ۔

"لیمن جوس پیجئے گا یا ـــ"

"میں تو سادہ پانی پیوں گی" خاتون نے ایئر ہوسٹس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا ۔

"اور آپ ؟" ایئر ہوسٹس نے ندیم سے پوچھا۔

"لیمن جوس۔" ندیم نے جیسے بالکل سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا ہو۔

"ہاں میڈم۔ ہم بندھن سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔" ندیم نے بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں زندگی میں سب سے اہم چیز بندھن ہیں — اگرچہ ہر شخص اکیلا ہے۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے زندگی کے سفر کو خوشگوار بنانے کے لئے یا یوں کہہ لیجئے زندگی کے جبر سے نبٹنے کے لئے رشتوں کی اشد ضرورت ہے۔ انسان رشتوں کے بغیر قطعی اُدھورا ہے۔ کٹھ پتلیوں کی طرح جن سے دھاگے علیحدہ کر دیئے گئے ہوں۔

کیا آپ نے مجھے فلاسفر سمجھا ہے جو مجھ سے اتنی ثقیل گفتگو کر رہے ہیں ؟" خاتون نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

معاف کیجئے گا۔ اگر آپ کی طبع نازک پر میری باتیں ناگوار گذری ہیں تو میں معافی کا خواستگوار ہوں۔

نہیں نہیں۔ ایسا مت کہیئے۔ آپ تو بُرا مان گئے۔ میں تو صرف اس بات پر حیران تھی کہ اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ آج تک میں نے بیسیوں سفر کیئے ہیں۔ لیکن آج پہلا موقع ہے کہ مجھے آپ جیسا ہمسفر ملا ہے۔ ایک ایسا ہمسفر جیسے دراصل میری پوری زندگی کا ندیم ہونا چاہیئے تھا۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میری زندگی کا حقیقی ندیم ایک ایسا شخص ہے جسے کم از کم میں یہ سمجھتی ہوں کہ زندگی کا سفر کرنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ میرا شوہر گوشت کا ایک ایسا تابوت ہے جس کی کھوپڑی میں ٹھونس ٹھونس کر چھیچھڑے بھرے ہوں — ہاں آپ بہت خوبصورت بات کر رہے تھے۔ کہ زندگی کی اہم ترین چیز بندھن ہیں" خاتون کے لہجے میں شائد طنز تھی

"ہاں بالکل ! اور وہ اس لیے کہ آپ نے اس رشتے کا غلط انتخاب کیا ہے۔ رشتے اس لحاظ سے بھی تو اہم ہوتے ہیں۔ کہ آپ ان کے چناؤ میں کتنی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں ــــ"

"ندیم نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا ۔

"میں آپ کی بات سمجھتی ہوں ۔ میرا اور میرے شوہر کا رشتہ صرف گوشت کا رشتہ ہے ۔ جیسے ایک نر جانور کا رشتہ ایک مادہ جانور کے ساتھ ہوتا ہے ۔ اس سے آگے ہم بالکل جُدا ہیں ۔ الگ الگ ۔ دو اینٹوں کی طرح جنہیں صرف مٹی کے گارے سے جوڑ دیا گیا ہو۔ میں سمجھتی ہوں ذہنی رشتے جسمانی رشتوں سے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں ۔ ہم انسان ہیں اور صرف ذہن ہی ہمیں جانوروں سے جُدا کرتا ہے ۔ اور یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ہم ابھی تک ذہنی رشتوں کی اہمیت سے نا آشنا ہیں ــ"

آپ نے میرے دِل کی بات چھین لی ہے ۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ۔ ہمارے رشتے بالکل حیوانی سطح پر بنائے جاتے ہیں ۔ میں نے ابھی تک اسی لئے شادی نہیں کی کہ میرے نزدیک جیون ساتھی سے حقیقی رشتہ ذہنی ہوتا ہے ۔ آج آپ سے مل کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں آپ کو صدیوں سے جانتا ہوں۔ کتنا سکون مِل رہا ہے آپ کے ساتھ ــ کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو ــ"

آپ جذباتی ہو رہے ہیں" خاتون نے خود جذباتی ہوتے ہوئے کہا ۔

"اپنے احساس کی زبان بول رہا ہوں ۔ اخلاقیات سے مبرّا زبان ۔ میں جانتا ہوں آپ شادی شدہ ہیں ۔ مجھے آپ سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں ۔ لیکن یقین مانئے میڈم مجھے بالکل آپ جیسی خاتون کی تلاش تھی ۔ بالکل آپ جیسی !"

"اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ میری زندگی کے ہمسفر بن جائیں تو کیا آپ واقعی مجھ سے شادی کرلیں گے ؟ خاتون نے پوچھا ۔

فوراً۔ ایسا جیون ساتھی تو نصیب والوں کو ملتا ہے۔ ایسا ساتھی جس سے انسان گھنٹوں بیٹھے باتیں کر سکتے دنیا کے سارے موضوعات پر — کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں کہ آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

"ہاں۔ میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں گی۔ وہ بھی مجھ سے تنگ ہے۔" خاتون نے ندیم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

ندیم نے ہاتھ دباتے ہوئے کہا — تم کتنی سویٹ ہو۔"

نیویارک پہنچنے سے پہلے وہ ایک رات کے لئے پیرس ٹھہر گئے۔

دونوں نے بے شمار موضوعات پر گھنٹوں باتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے جیسے وہ جنم جنم سے اکٹھے رہے ہوں۔ پیرس کے خوبصورت ہوٹل کے کمرہ نمبر ایک میں وہ دو جگنوؤں کی طرح جلتے رہے۔ بجھتے رہے حتیٰ کہ سویرا پھوٹنے لگا۔

دوسرے دن صبح جب وہ نیویارک جانے کے لئے دوسرے جہاز میں بیٹھے تھے تو ان کی سیٹیں الگ تھیں۔

خاتون سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں بالکل وہی شور تھا جو جہاز میں سے اٹھتے ہوئے اٹھا تھا۔ بے شمار خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا کر زور دار دھماکوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ وہ حیران تھی کہ ندیم نے رات ہی رات میں شادی کا فیصلہ کیوں ترک کر دیا ہے۔ آخر وہ کیوں چپ ہے۔ کیا نقص ہے مجھ میں؟ چلو نقص سہی مگر وہ بتاتا کیوں نہیں۔ اس نے ندیم سے کئی کئی حیلوں اور بہانوں کے ذریعے پوچھنے کی تمام کوششیں کی تھیں مگر ندیم بالکل خاموش تھا۔ زنگ آلود دروازے کی طرح جو بھنچ کر بند ہو گیا ہو۔

نیویارک ائرپورٹ پر خاتون نے ندیم سے پھر پوچھا۔

مگر کیوں۔ تم نے اپنا فیصلہ کیوں بدل لیا ہے ندیم؟ تم نے تو کہا تھا کہ ذہنی رشتے ہی حقیقی

رشتے ہوتے ہیں۔ تم نے مان لیا تھا کہ میں تمہاری آئیڈیل ہوں۔ ہم گھل مل گئے تھے۔ ندیم بتاؤ خدا کے لئے بتاؤ ندیم۔ میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ میں تمہاری گھٹیا بات کا بُرا نہیں مناؤں گی۔ پلیز ندیم۔ بتاؤ میرے لئے یہ ایک عظیم تجربہ ہوگا۔

میں غلط تھا میڈم۔ ذہنی رشتے حقیقی رشتے ہوتے ہیں۔ مگر صرف ذہنی رشتے ہی حقیقی رشتے نہیں ہوتے۔ ہم شاید سب بنیادی طور پر جانور ہیں۔ ہمیں اپنے جانور کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ ماننا پڑے گا کہ جانور کی بھی ایک اہمیت ہے۔"

"کھلے لفظوں میں کہو ندیم۔ مجھ سے فلسفے کی زبان میں نہیں، تجربے کی زبان میں بات کرو۔"

"نہیں میڈم۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔" تمہیں کرنا ہوگا۔ ورنہ میں شوٹ کر دوں گی"۔ خاتون نے اپنے پرس سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

"میڈم آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں۔"

"ہاں میں سیکھنا چاہتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"اچھا تو سنو۔ میڈم۔ آئی ایم سوری۔ لیکن چونکہ آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں۔ اس لئے مجھے بتانا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں کہیئے" خاتون نے ریوالور کو دوبارہ پرس میں ڈالتے ہوئے کہا

"میڈم۔ تمہارے جسم کا گوشت بہت پلپلا ہے۔ بہت پلپلا۔ چھچھوڑوں کی طرح" خاتون نے ایک زوردار قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تو تم اپنا جیون ساتھی ایک ایسی فلاسفر لڑکی میں ڈھونڈنے کی کوشش کرو گے جس کے بدن میں ریوڑھی جیسی کڑک ہو۔ بہت خوب۔ بہت خوب"

ندیم اب سوچ کی نئی لہروں کا ناخدا تھا۔

گجرو

معاشرے کی کھینچا تانی کی وجہ سے محبت کے
رشتے بتدریج نفرت کی کوپر پگھلتے رہتے ہیں۔

گجرو کے سیاہ ہاتھوں پر اُبھری ہوئی نسیں

یوں لگتی ہیں جیسے سیاہ مٹی پر ڈھیر سارے کینچوے یخ بستہ ہو گئے ہوں۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر قسمت۔ دماغ اور دل کی لکیریں آپس میں اس طرح گڈمڈ نظر آتی ہیں جیسے تقدیر بنانے والا یا تو گجرو کو بناتے وقت جھنجھلا یا بیٹھا تھا۔ یا پھر اس نے دیدہ دانستہ گجرو کو زندگی کے اس جہنم میں پھینک دیا ہے جہاں وہ پچھلے ساٹھ سال سے انجانے جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔

گجرو کا کام بہت جان لیوا ہے۔ سارا دن مٹی کھودنا۔ منوں من مٹی۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ مٹی کھودنا شروع کی تھی۔ پوری عمر مٹی کھودنے کے باوجود وہ ابھی تک مٹی ہی کے گھر میں رہتا ہے۔ مٹی جو بارش میں بھیگ جاتی ہے۔ مٹی جو سورج کی کرنوں تلے سوکھ کر بُربری ہو جاتی ہے۔ مٹی جس کی کوئی شکل نہیں۔ مٹی جس سے شکلیں بنائی جاتی ہیں اچھی یا بُری دونوں۔

گجرو نے شاید کبھی سوچا بھی نہ ہو کہ آخر کیوں اُس کی بستی کے سارے لوگ پچھلے ان گنت سالوں سے کینچوؤں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیوں سوچے گجرو؟ گجرو تو یہ سوچتا ہے کہ نیلے آسمان پہ حکومت کرنے والا سردیوتا جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے رزق اور آرام و آسائش تو خدا کی دین ہے۔ بندے کی کیا مجال کہ وہ سردیوتا کی مرضی میں مُخل ہو۔ اور شاید اسی وجہ سے گاؤں کے سارے لوگ کیچڑ۔ بدبو۔ بھوک اور بیماری کے وہ انسانی ڈھانچے ہیں جن میں عقیدوں کا بھوسہ بھرا ہے اور جو ابھی تک بے جان عقیدوں کی دلدل میں کندھوں تک دھنسے پڑے ہیں۔

مہنگائی کے زمانے میں روٹی پوری کرنا ہی اتنا عذاب ہے کہ جان ٹوٹتی ہے۔ دل کو جانے کن کن بہانوں سے آنے والے اچھے دنوں کا بہلاوا دے کر دھڑکتے رہنے پہ آمادہ کیا جاتا ہے — گجرو بھی جھوٹے سہاروں کا ٹوٹا مندر ہے۔ صرف اس لئے زندہ ہے کہ تین بیٹیوں کو پالنا ہے۔

بیٹیاں — جو گجرو کے گاؤں میں اس لئے بوجھ بن گئی ہیں کہ گاؤں کی روایات خرد بھاری ہیں۔

پچھلے کئی دنوں سے گجرو کو کوئی کام نہیں ملا۔ گھر میں سارے راشن کو گجرو اور اس کی بیٹیاں دیمک کی طرح چاٹ گئیں ہیں۔ اب تو آٹے کی مٹی بھی خالی ہو چکی ہے۔ گجرو اپنی بیٹیوں کے بے جان مٹیالے رنگی چہرے دیکھتا ہے۔ تو اُس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اُسی تیشے سے اپنا سر پھوڑے جس سے اُس نے ساری زندگی مٹی کھودی ہے۔ مگر پھر وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر اُس نے خودکشی کر لی تو اُس کی تین بیٹیوں کو کون سہارا دے گا۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے وہ مجبوراً مٹی کھودنا چاہتا ہے۔ مگر کیا کرے پچھلے کئی دنوں سے دھندا بالکل ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ کہاں سے لائے کام؟ سردیوتا کے حضور میں کیا دعا مانگے۔

آج بھی سورج غروب ہونے کو ہے۔ لیکن ابھی تک اُسے کوئی کام نہیں ملا۔ کیا دکھائے گا منہ اپنی بیٹیوں کو؟ بھوک سے اگر سو نہ سکیں تو کون سے سورج سے رات کی طوالت ختم کرے گا؟

وہ مٹی کے ڈھیر پر اُداس بیٹھا خالی نظروں سے سامنے تک رہا تھا کہ درختوں کے جھنڈ سے دو آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اُس کے چہرے پر مہینوں پرانی رونق واپس لوٹ آئی اُس کا رواں رواں خوشی سے جھومنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کاش وہ ناچ سکے۔ مگر نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ آنے والے آدمی اُس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

گجرو مٹی کے ڈھیر سے اُٹھا تو آنے والے آدمیوں میں سے ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابا دو قبریں کھود دو ہمارے دو بھائی شہید ہو گئے ہیں۔"

"پچاس روپے فی قبر لوں گا۔ پچاس روپے فی قبر" گجرو کی آواز میں خوشی کی کھنک تھی

"لے لینا، پچاس ہی لے لینا" دوسرے آدمی نے گجرو کے مکروہ چہرے پر ابھرنے والی

شیطانیت کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

گجرو ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں بیلچہ اُٹھائے تیز تیز قدموں سے قبریں روندھتا ہوا قبرستان کی تاریکی میں یہ سوچتا ہوا غائب ہوگیا۔ "آج تو میری بیٹیاں پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گی۔"

موتی

○

زرد ہرے پتّے پیپل کے
شاخیں کئی ہزار
کوئل بیٹھی گیت یہ گائے
پیپل رے سنسار !

مال روڈ پر لگژری کے قریب

ایک لمبی سی کالی مرسیڈیز کار آ کر رُکی تو دائیں بائیں کھڑے تمام لوگ چند لمحوں کے لئے یوں خاموش ہو گئے جیسے اُن کی قوتِ گویائی کا سوئچ بھی کار میں بیٹھے ہوئے خوبصورت نوجوان کے ہاتھوں میں تھا۔

کار کی اگلی سیٹ پر سانولے رنگ کی ایک لڑکی اپنے کٹے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔

کار کی پچھلی سیٹ پر ایک خوفناک کتا اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے وہ ایک چیتے کے پوز میں تصویر کھنچوانا چاہتا ہو۔ کار پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی تھی جس کا ہر پتہ ہرا بھی تھا زرد بھی ——

"جی صاحب"، ایک بیرے نے کار کے قریب رکوع میں جھکتے ہوئے کہا۔

"کیا کھاؤ گی؟" صاحب نے لڑکی سے پوچھا۔

"چکن"— لڑکی نے یوں جواب دیا جیسے وہ کسی جزیرے کی شہزادی ہو۔

"یوں کرو" صاحب نے بیرے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "میرے لئے کافی لے آؤ۔ اور میم صاحب کے لئے ایک عدد چکن برگر"

صاحب اور کچھ؟ — بیرے نے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھو چکن برگر میں چکن ہی ہو۔ تم لوگ اکثر....."

"نہیں صاحب۔ بالکل ٹھیک ہوگا" بیرے نے کہا۔

"اچھا جاؤ اور ذرا جلدی واپس لوٹنا۔"

"ابھی آیا سر"

بیرے کے چلے جانے کے بعد خوبصورت نوجوان نے سانولے رنگ کی لڑکی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ملاوٹ کی وبا اتنی بڑھ چکی ہے کہ زندگی خود مرچوں میں پسی ہوئی اینٹوں کا چورہ معلوم ہوتی ہے۔"

"صاحب۔ مونیا کے گجرے ہیں۔ ہار ہیں۔ ٹاپس ہیں۔ انگوٹھیاں ہیں۔ کیا لیں گی میم صاحب؟" مونیا بیچنے والے لڑکے نے کہا۔

"گجرے لوگی؟" صاحب نے پوچھا۔

"لے دو۔" سانولی لڑکی نے فوراً جواب دیا۔

"دو گجرے دے دو — دیکھو تازہ ہوں۔ تم لوگ جو مال کل نہیں بکتا آج بیچ دیتے ہو۔"

"نہیں صاحب بالکل تازہ ہیں۔" لڑکے نے میم صاحب کو دو گجرے دیتے ہو کہا۔

"تم تو کہو گے تازہ ہیں۔ میں سب سمجھتا ہوں لڑکے۔" صاحب نے پیسے دیتے ہوئے کہا۔

پھول بیچنے والا لڑکا ابھی پیسے لے ہی رہا تھا کہ بیرا برتن اٹھائے کار کے قریب آ پہنچا۔

"لیجئے صاحب۔ بالکل سپیشل بنوایا ہے آپ کے لئے۔" بیرے کی آنکھوں میں ضرورت کی ہوس کے گہرے نقوش تھے۔

"چکن برگر ہی لائے ہو نا بے۔" صاحب نے وکیلانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں صاحب وہی جو آپ نے کہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔"

لڑکی نے برگر کھانا شروع کیا تو ایک ادھیڑ عمر کی خاتون ہاتھوں میں کنگھیوں کا ڈبہ اٹھائے کار کے ادھ کھلے شیشے سے یوں تک رہی تھی جیسے اس کی دونوں آنکھوں

میں بھوک کے دو جہنم جل جل کر آخر بجھ ہی گئے ہوں۔
"کنگھی لے لو میری رانی" خاتون نے اپنے شکستہ دانتوں سے بدبودار آواز نکالتے ہوئے کہا۔
"معاف کرو مائی۔ صاحب نے کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔
"صاحب۔ قسم سے میں صبح کی بھوکی ہوں۔ خاتون نے اپنے چہرے کی سلوٹوں میں بھوک کا کرب لاتے ہوئے کہا۔
میں سمجھتا ہوں تم لوگوں کو۔ تم فقیر جھوٹے ہو۔ بہت مالدار ہو تم۔ میں سب سمجھتا ہوں۔" صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"خدا کی قسم صاحب میں بھوکی ہوں۔"
"جانے دو مائی۔ ایسے ہی جھوٹی قسمیں کھا رہی ہو۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تم فقیروں کو۔ کسی اور کو اُلّو بنانا۔"
"بیٹا۔ تمہاری قسم میں بھوکی ہوں۔" خاتون نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔
"اچھا رونا نہیں یہ لو اور جاؤ" صاحب نے کچھ سکّے دیتے ہوئے کہا۔
"تھوڑی دیر کار میں بالکل خاموشی رہی۔
صاحب کو اچانک جیسے کوئی یاد آیا ہو
"موتی کچھ کھانا ہے؟ صاحب نے قدرے اُونچی آواز میں کہا۔
"اب کھانا تو کچھ نہیں البتہ کافی پیوں گی۔" سانولی لڑکی نے جواب دیا
"تو تمہارا نام بھی موتی ہے۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ عجیب اتفاق ہے۔"
صاحب نے اپنے کتے کی دُم ہلاتے ہوئے کہا۔
"صاحب آپ بہت خوبصورت ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ہی مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا۔

کہ آپ محبت کے پیکر ہیں۔ ورنہ اکثر گاہکوں کے چہرے بہت مکروہ ہوتے ہیں۔ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کریں کاروبار ہی ایسا ہے۔ چاہت ہو یا نہ ہو چاہت کی اداکاری ضرور کرنا پڑتی ہے۔ آپ بالکل فلمی ہیرو لگتے ہیں۔ آئیڈیل ہیرو۔ کاش میں آپ کی زندگی کی ہیروئن بن سکتی!

موتی نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا

"دیکھو موتی۔ مجھ سے اداکاری مت کرو۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ میں تم لوگوں کو سمجھتا ہوں۔" صاحب نے کافی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

قسم سے صاحب۔ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔" موتی نے اپنے ہونٹوں کو خود ہی چومتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلیں۔" صاحب نے بیرے کو پیسے دیتے ہوئے موتی سے کہا

"صاحب جہاں جی چاہے لے چلو۔ میں تمہاری ہوں۔ میرا نام تو آپ نے پوچھ لیا ہے۔ اب اپنا نام بھی تو بتائیں نا۔"

"بھٹی"۔ صاحب نے کہا۔

"دُلا بھٹی"؟ لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں — قاسم بھٹی —" صاحب نے کالی مرسیڈیز سٹارٹ کرتے ہوئے کہا

گھنگھرو

بعض رشتے صرف خوبصورت ہوتے ہیں

اور بس !

دیکھو آبی - تم بھی ایک لڑکی ہو۔

اور ایک ذہین لڑکی ہوتے ہوئے تم لڑکیوں کے جذبات کو بھی سمجھتی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے فری کے دل میں میرے لئے کوئی محبت نامی چیز ہے۔" ڈاکٹر ظفری نے پائپ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ فری کم از کم تمہیں نفرت نہیں کرتی۔ لیکن یہ بات میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتی کہ وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔ اگرچہ وہ ایک سادہ ذہن کی لڑکی ہے۔ پھر بھی ایک ملاقات میں کسی انسان کو سمجھنے کا دعویٰ کرنا محض شوخی ہے۔" آبی نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کیا میری شکل وصورت کا لڑکا جس کے پاس وہ ساری چیزیں ہوں جو میرے پاس ہیں اور وہ ساری چیزیں ہوں جو میرے پاس نہیں یعنی مجھ جیسا بالکل مجھ جیسا لڑکا فری کو حاصل کرنے کا حقدار ہے یا نہیں؟" ڈاکٹر نے سیلف میں کتاب رکھتے ہوئے کہا۔

مجھ سے پوچھو تو ہے۔ دیکھو ظفری تم نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔ اچھی خاصی تنخواہ لیتے ہو۔ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے تم جیسے لڑکے بہت کم ملتے ہیں۔" آبی ایک سادہ نمونے کی سوشلسٹ بن رہی تھی۔

"جہاں تک تمہاری شکل وصورت کا تعلق ہے دیکھو ظفری تمہیں خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا نا"

آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر ظفری نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ تمہیں دیکھ کر کوئی لڑکی اپنے منہ میں کسیلا پن محسوس کرتی ہے۔" آبی نے سلائیوں کو چھنکاتے ہوئے کہا۔

میں اس موضوع پر چپ رہوں گا۔ اپنی صورت کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا ایک مرد کے لئے خاصا مشکل ہوتا ہے۔" ڈاکٹر ظفری نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

اب رہی تیسری بات تو وہ تو فری جانتی ہی ہے کہ تم اُسے چاہتے ہو۔ میں نے اپنی ملاقات میں اسے اشاروں سے یہ سمجھا بھی دیا تھا کہ ڈاکٹر ظفری شادی کے لئے بھی سنجیدہ ہے۔" آبی نے سوئیٹر کا ایک پلڑا ختم کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم اپنی باتوں میں میری محبت یا سنجیدگی سے متعلق کوئی اشارہ کرتی تھیں۔ تو سمجھتی تو ضرور ہوگی۔ فری اتنی تو ذہین ہے لیکن یہ تم نے نہیں بتایا کہ وہ ان اشاروں کو کس طرح وصول کرتی تھی؟"

"اکثر اوقات تو بڑے خوبصورت انداز سے ہنس دیتی تھی؛ اور بعض دفعہ انتہائی سنجیدگی کیساتھ بات ٹال بھی دیتی تھی۔" آبی نے پلیٹ میں رکھے ہوئے سیب کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔

ہوں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک فری کے جذبات کھل کر سامنے نہیں آئے۔" ڈاکٹر ظفری نے سیب کا ایک ٹکڑا اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر ظفری۔ میرے خیال میں اب تمہیں خود ایک ملاقات کرنی چاہیئے۔"

میں تو تیار ہوں۔ صرف ایک بات سے ڈرتا ہوں۔ فری اپنے رویے میں ملاقات کے آداب سے زیادہ اجنبیت کی جھجک کو ترجیح دیتی ہے۔"

مجھے تو وہ بڑے پیار سے ملی تھی۔" آبی نے کہا۔

آبی۔ دنیا میں فری کے علاوہ کسی اور لڑکی کا نام لو۔ مجھے یقین ہے کہ میں بڑی مؤثر گفتگو کر سکتا ہوں۔ لیکن فری کے معاملے میں میں خود کو بہت کمزور محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے ڈر۔"

"ڈاکٹر ظفری تم فری سے اس لئے ڈرتے ہو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور دوسرا شاید اس لئے کہ تم نے اپنی زندگی میں آج تک بہت کم شکستیں کھائی ہیں۔ ایک ایسا شخص جس

کی زندگی میں اس کا سارا عروج اسے اپنی شخصیت کی وجہ سے حاصل ہوا ہو وہ سخت جان ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا نازک دل بھی ہوتا ہے۔ تمہیں اپنی شخصیت کا گھمنڈ ہے۔ ڈاکٹر ظفری تم اُس کے ٹوٹ جانے سے ڈرتے ہو۔

شخصیت کا گھمنڈ؟ ہو سکتا ہے ہو تمہاری ریڈنگ کو بالکل رد کر دینا بہت مشکل ہوتا ہے آبی۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو یہ فری کی شخصیت ہے جو مجھ سے میرا "اپنا پن" چھین لیتی ہے" ڈاکٹر ظفری نے قدرے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"فری کی شخصیت؟ نہیں ظفری فری بالکل ایک نارمل لڑکی ہے۔ وہ اتنی خوبصورت نہیں کہ تم خوفزدہ ہو جاؤ۔ اتنی ہوشیار نہیں کہ تمہیں لاجواب کر سکے۔ اتنی بدتمیز نہیں کہ تمہیں جھاڑ دے۔ وہ بالکل ایک نارمل لڑکی ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود بھی فری میں ایک عدد کوئی ایسی چیز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کونسی چیز ہے۔ لیکن ہے ضرور جو اُسے غیر معمولی اور مختلف لڑکی بناتی ہے۔

"وہ چیز تمہاری اپنی چاہت ہے ڈاکٹر ظفری اسی چاہت کی وجہ سے فری تمہیں ایک آئیڈیل نظر آتی ہے۔

ہاں تم کہہ رہی تھیں کہ اب مجھے خود فری سے ایک ملاقات کرنی چاہیئے"۔

بس اب یہی ایک طریقہ ہے۔ پچھلے سال سے تم نے بات کو لٹکایا ہوا ہے۔ اب سوچو کم اور کوئی عملی قدم اُٹھاؤ۔ جاؤ اپنی محبت کا اظہار کر دو۔ شاید وہ مان جائے"

کس بات کے لئے مان جائے۔ ڈاکٹر ظفری نے قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"شادی کے لئے۔ آبی نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں آبی میں اسے شادی کے لئے آمادہ کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ یا نہیں۔ اگر وہ میرے لئے کوئی چاہت

کے جذبات نہیں رکھتی تو اگر وہ شادی کے لئے آمادہ ہو بھی جائے تو میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ مجھے فری نہیں فری کی محبت چاہیئے۔"

بہت رومینٹک ہو ڈاکٹر۔ ایک طرف صرف دلیل کی بات کرتے ہو۔ اور دوسری طرف انتہائی جذباتی ہو جاتے ہو۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"محبت کا رشتہ احساس کے شہد سے جڑتا ہے دلیل کے سیمنٹ سے نہیں۔" ڈاکٹر ظفری نے پائپ میں نیا تمباکو ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو تم آج تیار ہو ملنے کے لئے۔

"ذہنی طور پر تو ہوں۔"

"تو چلو تیار ہو جاؤ۔" آبی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو کوئی قمیض ہی نہیں۔

"کیا"

میرے پاس پہننے کے لئے کوئی بھی اچھی قمیض نہیں ہے۔

"کمال کرتے ہو ظفری الماری میں بیسیوں قمیضیں ہیں۔ کوئی ایک سی پہن لو۔

"میرے خیال میں مجھے ایک نئی قمیض خریدنا چاہیئے۔ کریم کلر کی!

ظفری تم فری سے بات کرنے جا رہے ہو۔ فینسی شو پر نہیں" آبی نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم نہیں جانتیں۔ الماری میں پڑی تمام قمیضیں پرانی ہیں۔ ہاں دیکھو نوکر سے کہو میرے بوٹ پالش کر دے۔ میری کار کو بھی دھلوا دینا۔ اور ہاں ٹوتھ پیسٹ ختم ہو چکی ہے وہ بھی منگوا لینا۔ میں ذرا انارکلی سے نئی قمیض لے آؤں۔"

"ظفری۔ تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ دیکھو مجھے نیل کٹر دو۔ میرے ناخن بہت بڑھ چکے ہیں

ہاں مجھے کچھ پیسے بھی دو - میری جیب میں صرف تین سو روپے ہیں۔ گلے ہاتھوں میں نکٹائی اور ایک عدد نئی گھڑی بھی خرید لوں گا - دیکھو تو کتنی پُرانی ہو گئی ہے - یہ سو سٹ واچ ،،

،،ہاں آپی- یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ میں فری سے بات کیسے شروع کروں گا۔ آخر بات کرنے کا کوئی بہانہ بھی تو ہونا چاہیئے - دیکھو میں ایک سنجیدہ شخص ہوں مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں ایک آوارہ لڑکے کی طرح فری سے ڈرامہ بولتا رہوں -

وہ تو بڑا آسان ہے - فری ایک ڈاکٹر ہے - اور کوئی بھی شخص اسے جا کر مل سکتا ہے -

" لیکن آپی - میں کوئی بیمار آدمی تو نہیں کہ فری کو بطور ڈاکٹر کنسلٹ کروں -"

،،ظفری- تم بہانے کی بات کر رہے تھے - اس سے اچھا بہانہ کیا ہو سکتا ہے کہ تم ایک مریض ہو-

مریض ،، آپی نے سیب کا پھوک تھوکتے ہوئے کہا -

ڈاکٹر ظفری فری کے کلینک پہنچا تو فری ایک ایمرجنسی کیس میں مصروف تھی۔ وہ اس کے کلینک کے باہر چھوٹے سے باغیچے میں کھڑا زور زور سے اپنے پھیپھڑوں کو پھیلا کر سانس کھینچ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا میں آکسیجن کی مقدار یکدم ختم ہو گئی ہے - اس کا دِل ایک انجانے خوف سے لرزنے لگتا تو وہ کار کی چابیوں کو ہوا میں لہرا کر گنگنانا شروع کر دیتا۔ اپنے آپ کو ہزار قسم کے بہلاوے دیتا -

ڈاکٹر فری فارغ ہو گئی ہیں ؟" ظفری نے نرس سے پوچھا-

ہاں بیٹھی ہیں ؛ نرس ظفری کو دیکھے بغیر جواب دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی -

کیا میں اندر آ سکتا ہوں ؟" ظفری نے کلینک کا دروازہ کھولتے ہوئے اجازت مانگی

آئیے " فری نے آنے والے مریض کو دیکھے بغیر کہا -

ظفری اپنے قدموں کا وزن محسوس کرتا ہوا کرسی پر جا بیٹھا - ڈاکٹر فری کوئی نسخہ لکھنے

میں مصروف تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب فری نے ظفری کو دیکھا تو فری کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک موٹی سی تہہ اُبھر کر منجمد ہو گئی۔

جی فرمائیے۔۔۔ ڈاکٹر فری کے جواں لہجے میں ایک پرانے اور منجھے ہوئے ڈاکٹر کا لہجہ شامل تھا۔

کیا آپ تھوڑی دیر کے لیئے کلینک سے باہر آسکتی ہیں،" ڈاکٹر ظفری کا کلینک میں دَم گھُٹ رہا تھا۔

دیکھیئے میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے ایمرجنسی کیس اٹینڈ کرنا ہے۔" ڈاکٹر فری نے کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

"کتنے بجے فارغ ہو جائیں گی؟" ڈاکٹر ظفری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کہیئے آپ کو کیا کہنا ہے؟" ڈاکٹر فری نے ظفری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

"ڈاکٹر فری۔ میں جانتا ہوں آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ لیکن مجھے آپ سے انتہائی سنجیدہ بات کرنی ہے۔ اگر آپ مجھے کسی دن تھوڑا سا وقت دے سکیں تو آپ کی بہت عنایت ہوگی۔"

"اچھا۔ آپ انتظار کریں۔ میں آدھ گھنٹے میں فارغ ہو جاؤں گی۔" ڈاکٹر فری نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر فری ایمرجنسی روم میں چلی گئی تو ظفری کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بہت نازک آپریشن کے لئے جا رہی ہے۔ ایک ایسے مریض کے آپریشن کے لئے جس کے وجود کے سارے ریشے کھُل کر علیحدہ علیحدہ ہو گئے ہوں۔

ڈاکٹر ظفری خود شیشے کی کرچیوں کی طرح احساس کے فرش پر بکھر چکا تھا۔ ایک گہری اُداسی اُس کی ہڈیوں کے بیچ میں رِستی جا رہی تھی۔ ایک انجانے خوف اور ایک ہلکی سی اُمید

آپس میں گتھم گتھا ایک دوسرے کی حیات کو ختم کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور ماضی کا پچھلا ایک سال اُس کی آنکھوں کے سامنے خاموش فلم کی طرح رواں دواں تھا۔ پچھلے ستمبر میں جب وہ ڈاکٹر فری سے ملا تھا تو فری اُسے بہت اچھی لگی تھی ـــــ سانولے رنگ کی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی ـــ فری ـ ـــــــــــــــــ

تجربوں کی چبھن اور چاشنی میں کھویا کھویا وہ اس مسافر کی مانند لگ رہا تھا جسے راستے کی دشواری کیساتھ ساتھ منزل کی کشمش چلتے رہنے پر آمادہ کئے رکھتی ہے۔

آئیے۔ میرے کمرے میں تشریف لے آئیے"۔ ڈاکٹر فری نے ظفری کو سوچ کی نیند سے جگاتے ہوئے کہا۔

"ہوں ـ چلیئے"۔ ظفری نے چونکتے ہوئے کہا۔

ظفری فری کے کمرے میں پہنچا تو ایک بہت رومینٹک خیال اُس کی رُوح میں پیوست ہوگیا۔ کاش ہم دونوں اس کمرے میں اپنی ساری زندگی گزار دیں۔

بیٹھیے۔ ڈاکٹر فری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ظفری نے کرسی میں بیٹھتے ہوئے چاروں طرف نظر گھمائی تو دائیں جانب فری کے بالکل سامنے ایک خوبصورت کیلنڈر لٹک رہا تھا۔

"بہت خوبصورت کیلنڈر ہے"۔ ڈاکٹر ظفری نے کہا۔

"ہاں پچھلے سال کا ہے"۔ فری کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

"پھر تو اس کی افادیت ختم ہوچکی ہے،، ظفری نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔

"ہاں ـ لیکن خوبصورت تو ہے نا ـ" فری نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ظفری سوچ رہا تھا کیا بعض رشتے صرف خوبصورت ہوتے ہیں اور بس؟

"فرمائیے مسٹر ظفری۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ،،

"آپ جانتی تو ہیں۔ اب تو آپ ہی کو کچھ کہنا ہے۔
"مجھے؟"
"جی۔ آپ کو۔"
"مسٹر ظفری۔ ایک بات بتاؤں آپ کو۔"
"اسی لئے تو آیا ہوں۔"
میں نے آج تک کسی شخص کو نہیں چاہا۔"
یہ کیسے ممکن ہے۔"
آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ لیکن یقین کیجئے میں نے آج تک کسی مرد کو نہیں چاہا۔"
تمہیں تو خاصے لوگوں نے چاہا ہوگا۔" ڈاکٹر ظفری نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا۔
"ہاں میں چھوٹی سی تھی کہ رشتے آنا شروع ہو گئے تھے۔" ذی نے معصومیت سے کہا۔
"کیا آج تک آپ کو کوئی رشتہ پسند نہیں آیا؟"
"جی نہیں۔"
"کیا آپ کو شادی سے نفرت ہے۔
نہیں تو۔ جب جی چاہے گا۔ کر لوں گی۔"
ابھی تک آپ کا جی نہیں چاہا۔
"جی نہیں۔"
"کہو کہ جی ہی نہیں۔" ڈاکٹر ظفری نے بات سے بات نکالتے ہوئے کہا۔
"جی تو ہے۔ لیکن جی نہیں کہوں گی۔"
"ڈاکٹر ظفری اتنا اکڑو۔ اتنا اکڑو کہ ٹوٹ جاؤ۔"

"بددعا دے رہی ہیں آپ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بے شمار لوگ یہ مجھے بددعائیں دیتے ہیں۔"

نہیں ڈاکٹر فری۔ میں تمہارے لیے کبھی بددعا نہیں مانگوں گا۔ خدا کرے تمہارا یہ تکبر یونہی سلامت رہے۔ یہ بھی تو حسن کا جزو ہے — فری یہ بتاؤ کیا میں تمہیں پسند ہوں؟"

پسند یا ناپسند کا سوال نہیں مسٹر ظفری۔ مجھے جذباتیت سے سخت نفرت ہے۔ محبت؟ کیا ہے یہ رشتہ؟ شعور کا اندھا پن —

ایک خوبصورت مزار جس میں مُردے کی کھوکھلی ہڈیوں پر عقیدت کے چراغ جلتے ہیں۔ آوارہ جذبات کو شاعروں کا دیا ہوا خوبصورت نام۔ مجھے محبت سے نفرت ہے۔ مجھے محبت سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر ظفری۔ یہ سب ڈھونگ ہے۔ نازک مزاج لوگوں کی اکلوتی ایجاد کا نام۔ مجھے اپنے پروفیشن سے عقیدت ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں، مجھے سب مریضوں سے محبت ہونا چاہیئے۔ کسی ایک مریض سے نہیں، میں وہ نہر ہوں جس سے سارا گاؤں پانی کھینچتا ہے۔ میں اپنی محبت تقسیم کروں گی۔ اور جو شخص میرے اور میرے پروفیشن کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا چاہے گا۔ میں اسے بہت نفرت کروں گی۔

تو تم نے اس مسئلے کا کیا حل سوچا ہے۔

بس یہی کہ میں ایک ڈاکٹر سے شادی کروں گی اپنے ہم پیشہ سے ایک ایسے شخص سے جو میرے پروفیشن کو سمجھتا ہو، پروفیشن کے لوازمات کو سمجھتا ہو۔ تو تم صرف ایک ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ تمہیں ایک شخص کی نہیں۔ بس ایک سمبل کی تلاش ہے ایک بے جان سہارے کی؟"

نہیں۔ مجھے ایک سمبل میں شخص کی تلاش ہے۔

یہ تو ایک عجیب آئیڈیل ہے

ہے تو سہی۔

کب تک انتظار کرو گی

"پوری زندگی"

"تب تو تمہارے بالوں میں چاندنی پھیل جائے گی"

"پھر کیا ہوا۔ اپنا پیشہ تو کر سکوں گی نا"

"کتنی عجیب بات ہے ڈاکٹر فری۔ ہم دونوں ڈاکٹر ہیں۔ تم تو میری آئیڈیل ہو لیکن میں تمہارے پیشے کا ڈاکٹر نہیں"

"ڈاکٹر ظفری کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں بے شمار گھنگھرو صرف ایک لفظ کا ورد کر رہے ہوں۔ "پیشہ۔ پیشہ"

"نہیں مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔ فری ایک مقدس لڑکی ہے۔

گھنگھرو مسلسل شور کر رہے تھے۔

"آخر وہ کونسی چیز ہے جس نے فری کو انسان سے صرف ایک ڈاکٹر بنا دیا ہے؟ ڈاکٹر ظفری کا سارا فلسفہ کھنکھناتے گھنگھروؤں کی آواز میں اپنا دم توڑ رہا تھا۔

کھنڈر

○

ایک بات میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ
درو کا رشتہ ہی حقیقی رشتہ ہے ۔

جولین میرے ڈرائنگ روم میں

صوفے پر پیروں سمیت بیٹھے پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل چُرس پی رہی ہے۔ میں نیچے قالین پر بیٹھا اُس کی ادھ کھلی آنکھوں میں یُوں تک رہا ہوں جیسے ابھی وُہ کانچ کی مُورت بن جائے گی۔ اور میں ستار سے نکلنے والی مدھم دُھن پر پُوجا کا ناچ شروع کر دوں گا۔ نیچے قالین پر میرے بالکل قریب ٹونی بیٹھا ہے۔ جو اپنی انگلیوں کے ذریعے ستار کی تاروں میں کھو جانا چاہتا ہے۔

جولین اور ٹونی مجھے اومنی بس میں ملے تھے۔ ریگل چوک کے قریب جب بس نے دائیں جانب موڑ کاٹا تو پیپل کے پیڑ کے پتوں کے پیچھے سورج ڈوبنے والی سُرخی میں تحلیل ہو چکا تھا۔ اِس منظر کو دیکھتے ہی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی انگریز ہپی لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہا ——— "وہ سامنے دیکھو ٹونی — آج کا دِن بھی ختم ہو رہا ہے۔" اس کے لہجے میں اس قدر تاسف اور دُکھ تھا جیسے اُس کے اپنے وجود کے اندر آج کا سُورج بھی غروب ہو رہا ہے۔

جامنی رنگ کی شلوار قمیض پہنے اور اپنے لمبے لمبے بالوں کو آزاد چھوڑے وہ یقیناً کسی شاعر کا تخیّل لگ رہی تھی۔ ایک ایسی آئیڈیل تصویر جس کی تعمیر صرف محبت کے ریشوں سے کی گئی ہو۔

میں جولین سے اِس قدر متاثر ہوا کہ جب وہ دونوں بس سے نیچے اترے تو میں نے ان کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل پر جا رُکے۔ ہوٹل کیا تھا سڑک کے کنارے ایک چھونپڑی تھی جہاں پر ایک بوڑھا بابا چائے بیچ کر اپنی زندگی کی سزا پوری کر رہا تھا۔ اُنہوں نے دو چائے کی پیالیوں کے لئے کہا اور سڑک کے کنارے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر جا بیٹھا۔

وہ دونوں خاموش بیٹھے بوڑھے آدمی کو یوں دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی بدصورت جانور ہے جو عمر کی سلاخوں کے پیچھے بھوک کے پتھر پر اذیت کی زنجیر سے بندھا ہو۔

"بے چارا آدمی! دیکھو ٹونی یہ لوگ کتنے غریب ہیں۔ لندن میں رہ کر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انسان ابھی تک کینچوؤں سے بدتر زندگی گزار رہا ہے"۔ جولین کے لہجے میں کرب تھا۔

"ہاں جولین۔ تم ٹھیک کہتی ہو" ٹونی نے بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات ضرور ہے ٹونی۔ اس اذیت ناک غربت اور جہالت کے باوجود دیکھو تو یہ بوڑھا آدمی کتنا پُرسکون لگتا ہے جیسے زندگی کے سارے غم اس کے وجود کی دہلیز کے باہر ہی پاش پاش ہو گئے ہوں۔ کتنا پُرسکون ہے یہ بوڑھا۔ کاش میں اس کی بیٹی ہوتی!"

نہ رہ سکا تو میں نے گفتگو میں مداخلت کی معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"یہ بوڑھا بالکل پُرسکون آدمی نہیں ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ بالکل تنہا رہتا ہے۔ میں نے اسے گھنٹوں روتے دیکھا ہے۔ یہ کبھی اپنی غربت پر روتا ہے۔ کبھی، موت کے ہاتھوں ٹوٹے ہوئے رشتوں پر۔ کبھی ساتھیوں کی شناسائی پر۔ کبھی شناساؤں کی بے وفائی پر۔ یہ ایک رستا ہوا زخم ہے جس پر کبھی کبھی سکون کا کھرنڈ آجاتا ہے۔ ایک کھرنڈ جو بہت جلد خود ہی چھِل جاتا ہے۔ یہ بوڑھا آدمی دکھوں کا پتھریلا کھنڈر ہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" جولین نے اپنی نیلی آنکھوں کی گہرائی سے لفظوں میں موتی بھرتے ہوئے کہا۔

ہم کافی دیر بیٹھے چائے پیتے رہے۔

رات کی شدت بڑھی تو وہ مجھے اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے گئے۔

جولین نے ٹونی سے کہا "ٹونی جاؤ ویگن کے اوپر لکڑیوں کا گٹھا پڑا ہے وہ لے آؤ میں آگ جلاؤں گی"۔

ٹونی لکڑیوں کا گٹھا لیکر آیا تو جولین آتش دان کے قریب اپنے پیروں پر بیٹھ گئی اُس نے گٹھا کھولا اور بڑی خوبصورتی سے آتش دان میں لکڑیاں سجانے لگی۔

گھونسلہ بنا رہی ہو جولین؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اور ابھی میں اسے آگ بھی لگا دوں گی" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آگ ہی لگانی ہے تو لکڑیوں کو آتش دان میں سجا کیوں رہی ہو" میں نے بات کھولتے ہوئے وضاحت چاہی۔

"اس لئے کہ آگ دیکھنے میں خوبصورت لگے" جولین نے جواب دیا۔

اس نے لکڑیوں کو سجا کر جب ماچس سے آگ جلائی۔ تو تھوڑی ہی دیر بعد آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ واقعی آگ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی حسین جسم تعمیر ہو رہا ہو۔

آخری بار وہ مجھے پھر اپنے ہوٹل میں ملی تھی۔ ہوٹل کی چھت پر وہ دھوپ میں لیٹی تھی۔ میں پہنچا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے گلے ملی اور کہنے لگی۔

"میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔ کبھی نہیں بھولوں گی"

"جولین دیکھو تو یہ پرندہ کیا کر رہا ہے" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پہ ایک باز بیٹھا تھا۔ جسے شاید اُسنے دھاگے

کے ساتھ اپنے ہاتھ سے باندھ رکھا تھا۔ وہ باز اپنی گردن موڑ کر وقتاً فوقتاً اُس کے بازو پر اپنی چونچ کے ساتھ بڑی شدّت سے کاٹتا تھا۔ اُس کے بازو پر باز کے بار بار کاٹنے کی وجہ سے ایک گڑھا سا کھُد چکا تھا۔ جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اور اس کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے دانے باز کی چونچ سے چپٹے تھے۔

"جولین۔ خدا کے لئے روکو اس جانور کو۔ تمہیں تکلیف نہیں ہوتی جولین؟"

"ہوتی ہے۔" جولین نے کہا۔

"تو پھر تمہیں اسے روکتی کیوں نہیں؟"

اس لئے کہ یہ کھرنڈ اُتار رہا ہے۔ مجھے میرے وہ زخم دکھانے کے لئے جو میرے وجود نے میری رُوح میں پیدا کر دیئے ہیں۔ وہ دیکھو سورج پھر غروب ہو رہا ہے۔ سورج پھر غروب ہو رہا ہے! یہ سورج یونہی بھٹکتا رہے گا ــــ لیکن ہم ــــ ہم ختم ہو جائیں گے۔ اپنے رستے ہوئے زخم لے کر ــــ اپنی پنکچرڈ روح کے ساتھ جس میں ایک ہزار سوراخ ہو چکے ہیں۔"

دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹونی ستار کی دُھن میں کھویا ہوا تھا جیسے وہ ہوٹل کا خدا ہو۔

رَت جگے

○

احساس ایک مثبت تناؤ ہے۔

ڈاکٹر نے مریض کی نبض پر ہاتھ

دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں صاحب۔ آپ کو کیا تکلیف ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میں سو نہیں سکتا" مریض نے کہا۔

ڈاکٹر نے کاغذ کے پرزے پر دو تین شکستہ لکیریں کھینچیں اور مریض سے کہا۔

"یہ دوائی کھا لیجئے۔ انشاء اللہ افاقہ ہو جائے گا۔"

مریض نے کاغذ کے پرزے کو پڑھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے دوائی لینے نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں آپ بہت بڑے ماہر نفسیات بھی ہیں۔ دراصل میرا ایک مسئلہ ہے۔ اگر آپ مجھے چند منٹ عنایت کریں تو میں آپ کو منہ مانگی....."

"ہاں ہاں کہیئے" ڈاکٹر نے مریض کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر۔ خدا نے مجھے دنیا کی ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ ماشاء اللہ بہت پھیلا ہوا کاروبار ہے۔ خوبصورت گھر ہے۔ اچھی بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ سب کچھ ہے۔ سب کچھ ہے وہ تمام آسائشیں جو انسان نے اپنے سکون کے لئے ایجاد کی ہیں۔ لیکن ان تمام نعمتوں کے باوجود میں جب بھی رات کو سونے کی کوشش کرتا ہوں تو..... تو..... مجھے ..... تو مجھے....."

"ہاں ہاں کہیئے!" ڈاکٹر نے مریض کے چہرے پر ابھرنے والے تناؤ کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے بند کمرے میں بے شمار بچے بلک رہے ہیں۔ بلبلا رہے ہیں۔ میں گھبرا کر اپنے کانوں کو بند کرتا ہوں تو پھر وہی بچے بالکل وہی بچے میری نظروں کے سامنے آ جمع ہوتے ہیں۔ ان گنت بچے۔ جن کے جسم پر بدبودار کیچڑ کی تہیں جمی ہیں اور جو اپنے گندے اور تیز ناخنوں کے ساتھ میرے چہرے کو زخمی کرنے کے لئے بڑھتے ہی چلے آتے ہیں۔ بڑھتے ہی چلے آتے ہیں۔ میں خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بھی بند کر لیتا ہوں

تو پھر ڈاکٹر صاحب مجھے یوں لگتا ہے جیسے بچوں کے جسم پر جمے ہوئے بدبودار کیچڑ نے میرے مکرنے میں اتنا تعفن پھیلا دیا ہے کہ بدبو سے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔۔۔
ڈاکٹر صاحب یہ بچے کون ہیں۔ میں نے ان بچوں کا کیا بگاڑا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر میں تو بہت خوبصورت جگہ پہ رہتا ہوں۔ وہاں تو بچے بہت پیارے ہیں۔ قیمتی کپڑوں میں ملبوس۔ کاروں کی پچھلی سیٹ پر ربڑ کے کتوں سے کھیلتے ہوئے بچے۔ صاف ستھرے بچے جن کی آیائیں انہیں خوشبودار پاؤڈر سے معطر رکھتی ہیں ـــــ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ڈاکٹر ـــــ میں سونا چاہتا ہوں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ میں جاگ جاگ کر تنگ آگیا ہوں ڈاکٹر۔ میں ان بچوں کو کیا کروں ڈاکٹر؟

مریض کو انتہائی بے چین دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا۔

"گھبرائیے نہیں شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔ کیا آپ میرے چند سوالات کا جواب دینا پسند فرمائیں گے۔؟"

"کیوں نہیں ڈاکٹر۔ کیوں نہیں۔ میں ان بچوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ میں سونا چاہتا ہوں ڈاکٹر!"

"پہلے تو میں آپ سے تعارف چاہوں گا" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نام تو میرا ملک نصیب احمد ہے۔ لکھتا ایم۔ این۔ احمد ہوں۔ ویسے یار دوست مجھے پیار سے ایم۔ این۔ اے کہتے ہیں۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تو سب بڑے آدمیوں کی طرح آپ کے بھی بہت سارے نام ہیں ـــــ ہاں تو آپ ـــــ کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"بزنس۔ بہت اچھا بزنس ہے!"

کہاں رہتے ہیں آپ؟"

"شادمان!"

"کتنی دیر سے؟"

"پچھلے بیس سالوں سے!"

"اس سے پہلے؟" ڈاکٹر حیران تھا کہ بیس سال پہلے تو شادمان میں جیل ہوا کرتی تھی۔

"جی؟" نصیب نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"شادمان سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"شادمان سے پہلے؟"

"ہاں۔ شادمان سے پہلے" ڈاکٹر بھی حیران تھا کہ سوال تو بہت آسان ہے۔ "شادمان سے پہلے۔ لیکن ڈاکٹر یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ بیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔

ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ جاننا چاہوں گا کہ شادمان سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے۔ یہ سارے سوالات آپ ہی کی صحت مندی کے لئے ہیں۔ خدانخواستہ میں آپ کو ناراض کرنا تو نہیں چاہتا" ڈاکٹر نے نصیب کو نفسیاتی مریض سمجھتے ہوئے اپنی زبان میں شیرینی بھر لی تھی۔

"شادمان سے پہلے؟" نصیب نے اپنے چہرے سے شاید یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے وہ ذہن پر بہت زور دے رہا ہو۔ "بہت پرانی بات ہے۔ آج سے گویا بیس سال پہلے — تب ہم — ہاں ڈاکٹر صاحب تب ہم شاید گھوڑے شاہ رہتے تھے۔ لیکن یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ مجھے تو تقریباً تقریباً بھول ہی چکا ہے"

"ہوں!" ڈاکٹر نے کرسی کو گھماتے ہوئے کہا۔

"گھوڑے شاہ کیسا علاقہ ہے"؟ ڈاکٹر نے جیسے نصیب کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو
"میں کیا جانوں۔ میرا کیا رشتہ ہے گھوڑے شاہ سے۔ مجھے تو وہاں گئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ بیس سال ڈاکٹر۔"

"بیس سال پہلے گھوڑے شاہ کیسا علاقہ تھا؟" ڈاکٹر نے سوال واضح کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے اب ہے۔ میرا مطلب ہے میں کوئی کمپیوٹر تو نہیں کہ چیزوں کو اتنی صفائی سے یاد رکھ سکوں۔ میں انسان ہوں ڈاکٹر انسان!"

نصیب کے چہرے کے تمام دھاگے ٹوٹ چکے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک زرد آندھی اُبھری اور پھیلتی چلی گئی۔

میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے ڈاکٹر۔ مجھے اسپرین دو۔ اسپرین۔
نصیب نے اپنا سر ڈاکٹر کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اسپرین میرے پاس نہیں۔" ڈاکٹر نے لفظوں کو پیستے ہوئے کہا۔

"اسپرین تمہارے پاس نہیں؟ تم کیسے ڈاکٹر ہو اسپرین بھی تمہارے پاس نہیں"

"نہیں نصیب صاحب۔ میں صرف مرض کی تشخیص کرتا ہوں۔" ڈاکٹر نے سامنے دیوار پر لگے ہوئے اے۔ بی سی کے چارٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اجازت دو ڈاکٹر" نصیب نے اُٹھتے ہوئے کہا

"میری فیس" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نصیب نے اپنی جیب سے سو سو کے کئی نوٹ نکالے اور انہیں گنے بغیر ڈاکٹر کی میز پر رکھتے ہوئے باہر چلا گیا۔

کٹھ پُتلی

کٹھ پُتلی موت کا حقیر رُخ ہے۔

آج بازار بند ہے

نہ جھلملاتی آنکھیں نہ گھنگھروؤں کا بلاوا۔ نہ کھنکھتے جسموں کی نمائش ہے ۔ نہ سودا خریدنے والوں کا ہجوم نہ کوئی موتیا کے ہار بیچ رہا ہے ۔ نہ کسی ملنگ نے اپنے کشکول میں دھونی سلگائی ہے ۔

بس ایک اندھیرا ہے ایک خاموشی ہے

روشنیوں کا بازار بند ہے !

روشنی ـــــ کہتے ہیں زندگی کی دلیل ہے ـــ ہوگی ۔

بازار ـــ جہاں زندگی قسطوں میں بکتی ہے ـــ بکتی تو ہے !

مگر آج "روشنیوں کے بازار" میں خرید و فروخت کا ناغہ ہے اور وہ اس لئے کہ آج نگو نے خودکشی کر لی ہے ۔ آج یعنی منگل کے دِن ۔ آج تو گوشت کا بازار بھی بند ہے

نگو ـــ بازار کا وہ مقبول پتھر جس کے اردگرد ہزاروں دیوانے جھومتے ہوئے اَن گنت پھیرے بیتے تھے جیسے اپنے گناہ بخشوا رہے ہوں ۔

نگو ـــ فطرت کے خوبصورت ہاتھوں سے تراشا ہوا وہ انمول جسم جس کے مقدر میں صرف ایک لفظ تحریر کیا گیا تھا ـــ "فروخت"

بازار کی ساری طوائفیں اپنے اپنے لحافوں میں دبکے یہی سوچ رہی ہیں کہ نگو نے خودکشی کیوں کر لی ہے ۔ بازار میں سب سے اچھا دھندا تو نگو کا ہی تھا' ـــــ بازار میں گھومتے ہوئے ایک دلال نے "جلیبیاں" بیچنے والے سے یہ کہا ہے ـــ نگو کے مرنے سے ہزاروں "تماشبین" نہ تیری جلیبیاں کھانے آئیں گے ۔ نہ کوئی میری آواز پہ لبیک کہے گا ـــ 'باؤ جی مال چاہیئے' "

بازار ہی میں گھومتا ایک منچلا یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے "نگو کے مرنے سے فرشتوں کی تو عیش ہو گئی ہے" اور اسی بازار میں ایک باریش بزرگ نے جن کی پان سگریٹ کی دوکان

ہے۔ اُس منچلے کو یہ جواب دیا ہے۔ "بیٹیا ایسا کفر نہیں بکنا چاہیئے۔ بھلا فرشتوں کے پاس حوریں کم ہیں جو تیری نگو سے اٹھکیلیاں کریں گے۔"

چند سپاہی لمبے لمبے گرم کوٹوں کے کالروں میں اپنے سر چھپائے نگو سے ہی متعلق باتیں کر رہے ہیں۔

"بھی بڑی فراخدل!"

"بھتی تو رنڈی لیکن شکل و صورت سے کسی بہت امیر گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی"

وہ شاید اس لیئے کہ وہ ہمیشہ امیر گھرانوں کی ہی زینت بنتی تھی۔"

"ابے اچھا ہوا! ایک گناہ کی بوری ختم ہوئی۔ دوزخ میں جلے گی دوزخ میں!"

"تو کیا ہم دوزخ میں نہیں جلیں گے۔" ایک سپاہی نے اپنا چہرہ کوٹ کے کالر سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

نگو کی بُوا اپنی ہی سوچوں میں گم ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے چک جھمرہ اسٹیشن کا وہ پلیٹ فارم ہے جہاں وہ گاڑی تبدیل کرنے کے لیئے انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی گود میں نگو تھی۔ دو سال کی نگو۔ پچاس روپے میں بہت اچھا "بیس" مل گیا تھا۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی نگو جب اُس نے کہا ——

"وہ دیکھو کوا!" —— ایک کوا تُکے کھا رہا تھا۔ بوا کا تو جی ہی خراب ہو گیا تھا۔

نگو کے کوٹھے پر آج سب سے زیادہ غم طبلہ بجانے والے "رحمو" کو ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئے بُوا جی سے کہہ رہا تھا —— اماں نگو جیسی لڑکی نہیں ملے گی تجھے میرے ہاتھ پر تو دنیا بھر کا ناچتی تھی۔ میرا طبلہ پر ہاتھ پڑتا تھا تو اس کے جسم میں جیسے بجلی سی کوندجاتی تھی —— ہائے نگو۔ تو نے کیوں خودکشی کر لی ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ بُوا جی ذرا دوبارہ پڑھنا اُس خط کو۔

میز پر سفید کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہے۔ جس پر نگو نے آخری الفاظ تحریر کئے ہیں۔

میری بہنو۔

ابھی تھوڑی دیر بعد "یہ" نگو مر جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں کبھی خودکشی کا سوچ بھی سکوں گی۔ کچھ دیر پہلے جب میں دھندہ ختم کر کے واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہی تھی کہ اچانک میری نظر برآمدے میں پڑی ہوئی ایک ایسی چیز پر پڑی جسے میں پچھلے کئی سالوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن آج ___ نہ جانے کیوں۔ اس چیز کو دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ وہ نہیں وہ میں ہوں۔

میری بہنو۔ شاید تمہیں تعجب ہو کہ میں کیا لکھ رہی ہوں۔ لیکن آج میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے صرف ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو پہچانا ہے۔ آج مجھے پہلی بار اپنی حیات کے صحیح معنوں کا علم ہوا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں نے آج ایک چیز کو دیکھا ہے۔ دیکھتی تو پہلے بھی تھی۔ نظر آج آئی ہے وہ ہے بوا جی کے برآمدے میں پڑا ہوا تھوک دان آج مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ میں انسان نہیں زندگی کے برآمدے میں پڑا ہوا وہ تھوک دان ہوں جس میں بیمار لوگوں کی بلغم سے اور گندے خون کو سمیٹا جاتا ہے۔ اس تھوک دان سے آج میں اپنے تمام رشتے توڑ رہی ہوں ___ اپنے تمام رشتے توڑ رہی ہوں میری بہنو!

نگو

جگنوؤں کی طرح

○

گپ اندھیری رات میں ایک جگنو بھی ہو تو
خوف ٹوٹنے لگتا ہے ۔

سے گذر رہی تھی ۔ ایک گھپ اندھیری سرنگ سے ۔

حسین اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سرنگ کے اندھیروں میں جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی ہی آنکھوں کی بینائی تلاش کر رہا تھا۔ اُس نے کچھ سوچا اور ہنس دیا۔ وہ ہنسا تو خوشی سے بڑبڑانے لگا "اندھیروں میں سب اندھے ... ہوتے .... ہیں "

"اندھیروں ... میں .... سب - اندھے .... ہوتے ... ہیں "

ریل گاڑی سرنگ سے باہر نکلی تو اُس نے اپنے بازوؤں کو جھٹکنا چاہا۔ اچانک اس کی ہنسی ایک دردناک کرب میں تحلیل ہو گئی ۔ اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے سپاہی کی آنکھوں میں دیکھا تو اُس کی آنکھیں جیسے پھر اندھی ہو گئی ہوں ۔ جیسے سرنگ کا اندھیرا پھر واپس لوٹ آیا ہو - اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے چیخے ۔

اندھیروں میں سب اندھے ہوتے ہیں ۔

اندھیروں میں سب اندھے ہوتے ہیں ۔ اندھیروں میں ....

اس نے اپنے بازوؤں کو دوبارہ جھٹکنا چاہا تو سپاہی کی موٹی آواز اُس کی رُوح میں پیوست ہو گئی ۔

"حسین ہتھکڑیاں توڑنے کی کوشش کی تو مجھے مجبوراً کوئی سخت قدم اُٹھانا پڑے گا۔"

حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اُس نے سپاہی کے الفاظ تو سنے تھے مگر یقیناً وہ ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا - وہ تو سپاہی کی آواز کے ساتھ ہی خود اپنے اندھیروں میں کھو گیا تھا - جہاں تمام حواس خمسہ پر فالج گر تا ہے ۔

وہ کافی دیر خاموش بیٹھا سپاہی کی وردی کو تکتا رہا جیسے وہ اس موٹے ملیشیا کے نیچے گوشت کی وہ کھال دیکھنا چاہتا ہو جس میں نہ کوئی سپاہی ہوتا نہ کوئی مجرم ۔

اچانک اس نے دیوانہ وار سپاہی سے باتیں کرنا شروع کر دیں جیسے کوئی پاگل مدتوں کی جیب

کے بعد ایک دم چیخنا شروع کر دیے ۔

"کیا تم جانتے ہو مجھے کس لئے ان سلاخوں میں باندھا گیا ہے ۔ ؟

"نہیں" سپاہی نے بات ٹالتے ہوئے کہا ۔

"کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں ؟"

"ہاں تم حسین ہو ۔ سپاہی نے کہا ۔

"ہاں یہ تو تم جانتے ہو کہ میں حسین ہوں ۔ لیکن شاید تم یہ نہیں جانتے کہ حسین کون ہے میں تو اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہوں ۔ اگلے اسٹیشن پر میں فارغ ہو جاؤں گا ۔ پھر تم جانو اور نیا گارڈ سپاہی ــــ" سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا

"تم تو اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہو اپنا فرض نبھا رہے ہو ۔ حسین نے سوچتے ہوئے کہا ۔

اور پھر اچانک حسین نے چیخنا شروع کر دیا ــــ "لیکن میں بھی تو اپنا فرض نبھا رہا تھا ۔ اپنا فرض نبھا رہا تھا ۔ وہ دیکھو خونخوار کتے ! وہ دیکھو خونخوار کتے ! ہوا میں تیر رہے ہیں ۔ مت دیکھو میری سلاخوں کی طرف ۔ وہ دیکھو ہوا میں خونخوار کتے تیر رہے ہیں ۔ لیکن نہیں تم اِن کتوں کو نہیں دیکھ سکو گے ۔ تم اندھے ہو اندھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان کتوں کو دیکھ سکتا ہوں ۔ دیکھ سکتا ہوں ۔ باڈلے کتے ۔ ۔ ۔ ۔"

سٹیشن پر گاڑی رکی تو نیا گارڈ سپاہی کمرے میں داخل ہوا ۔

"چلیئے صاحب ۔ آپ کی ڈیوٹی تو ختم ہوئی ۔ کہاں ہے مریض میں نے ہسپتال میں پورا بندوبست کر دیا ہے ۔" نئے گارڈ سپاہی نے کہا ۔

"مریض مر چکا ہے"

"مریض مر چکا ہے ؟ نئے گارڈ سپاہی نے حیرت سے پوچھا ۔

ہاں مریض کو باؤلے کتوں نے کاٹا تھا۔ دراصل ہوا یوں کہ گاؤں میں بے شمار آوارہ کتے باولے کتے بن چکے تھے۔ ان باؤلے کتوں نے گاؤں کی ساری زندگی کو دوبھر کر دیا تھا۔ نہ کوئی فرد اپنے کام پر جا سکتا تھا۔ نہ بچے سکول جا سکتے تھے۔ نہ کوئی سڑک پر آ سکتا تھا۔ سودا سلف خریدنے کے لئے حسین گاؤں کا بہترین بہادر تھا۔ اس نے گاؤں کے چند نوجوان اکٹھے کئے اور ان باؤلے کتوں کو ختم کرنے کا پلان بنایا۔ کافی کتوں کو مارنے کے بعد چند باؤلے کتوں نے حسین پہ حملہ کر دیا۔ اور اسے بے شمار جگہوں سے کاٹ لیا۔ تمہیں اسی لئے ٹیلیگرام دی تھی کہ تم ہسپتال میں بندوبست کر سکو۔"

دونوں سپاہیوں نے مل کر حسین کی لاش کو گاڑی سے نیچے اتارا تو گاڑی کے پہیے جنبش میں آ چکے تھے۔ ــــــــــــــــــــ

توبہ کا پتھر

○

اگر کوئی خدا ہے تو آسمانوں پہ ہوگا۔
زمین پر تو نہیں!

ماں نے پرویز کا ماتھا چومتے ہوئے

التجا کی۔ "بیٹا خدا سے معافی مانگ لے۔ تو بالکل اچھا ہو جائے گا۔ منٹوں میں اچھا ہو جائے گا۔ خدا سے معافی مانگ لے۔ بیٹا خدا کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے۔"

"ماں میں نے کب خدا کو ناراض کیا ہے۔ میری یہ مجال کہاں" پرویز نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"دیکھ۔ تو نے بہت کفر بولا ہے۔ خدا کو تیری باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تیری زبان سے گستاخی اور بے ادبی کے بہت سے کلمات سننے میں آئے ہیں۔ بیٹا خدا سے توبہ کی بھیک مانگ۔ خدا کے حضور میں شرمندہ ہو۔ مجھے یقین ہے اگر تو نے سچے دل سے توبہ کی تو خدا تجھے ضرور معاف کر دے گا۔ تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

بالکل تندرست — پہلے کی طرح — بھاگنا پڑے گا میرا لال"

ماں کی بوڑھی آنکھوں میں مسلسل ساون کا مہینہ تھا۔

"ماں۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ ڈاکٹر مجھے دوا دے رہے ہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا" پرویز نے ماں کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا۔

"دیکھ پھر تو نے کفر کا کلمہ کہا ہے۔ خدا کی رضا نہیں ہو گی تو تو کیسے اچھا ہو گا۔ کیا کرے گی دوا۔ جب خدا کو تیری صحت ہی منظور نہ ہو گی۔؟"

"ماں تم بڑی بھولی ہو۔ بھلا خدا کو کیا مصیبت پڑی کہ اتنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دخل دیتا پھرے۔؟"

"بیٹا ایسی باتیں نہ کر۔ دیکھ میں تجھے جیسے کہہ رہی ہوں ویسا ہی کر۔ خدا سے توبہ مانگ۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ وہ تجھ کو ضرور معاف کر دے گا۔ تو بالکل اچھا ہو جائے گا۔"

"ماں۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ جسم کی بیماریاں جسم کی وجہ سے ہی نمودار ہوتی ہیں۔

جسم کے سارے حصے ایک خاص نظام کے تحت چلتے ہیں۔ کسی منچلے حاکم کے بدلتے ہوئے فیصلوں کے مطابق نہیں۔"

"بس کرو بس۔ ایسے بکتا چلا جا رہا ہے۔ سو بار پیٹا ہے خدا سے خوف کھایا کر دیکھتے نہیں جب سے تم نے یہ واہیات بکنا شروع کی ہے۔ تب سے تمہاری صحت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دو سال پہلے تم کتنے اچھے لڑکے تھے۔ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ یاد ہے مسجد میں اذان دیا کرتے تھے — اللہ غارت کرے انگریزی کتابوں کو جنہوں نے تم سے تمہارا ایمان چھین لیا ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے ماں کہ میں خدا کو نہیں مانتا۔ وہ ہے۔ لیکن وہ ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ جیسے ہم سمجھتے ہیں کہ بیماریاں۔ غربت اور دوسری صعوبتیں خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے ماں۔ غلط ہے کہ وہ انسانوں کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ ہم غریب اس لئے ہیں کہ کچھ لوگ ہمیں غریب ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بیمار اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کا ماحول بیمار ہے۔ ماں اگر انسان چاہے تو یہ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

"تو کافر ہو گیا ہے پرویز۔ تو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ تو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ خدا تجھے ضرور سزا دے گا۔"

ماں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

ماں —— پرویز نے آواز دی۔

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ماں میرے قریب آؤ ماں۔ مجھے یوں لگا ہے جیسے میرے جسم کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ ماں میرا ماتھا چومو۔ میرے جسم کے اندر کوئی چیز ٹوٹ رہی

ہے ؟" پرویز کی آواز میں کسی اداس شہنائی کی آخری سسکیاں تھیں۔
"خدا سے توبہ مانگ لے بیٹا۔ ابھی بھی بہت وقت ہے۔ خدا سے توبہ مانگ لے"
ماں نے دوبارہ التجا کرتے ہوئے کہا۔
"توبہ کیسے مانگتے ہیں ماں ؟" پرویز کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔
"مانگے گا توبہ ؟ — توتوبہ مانگے گا ؟" ماں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
ہاں ماں۔ میں توبہ مانگوں گا۔ تیرے لئے تیری خوشی کے لئے !"
جیتے رہو بیٹا ! اُٹھو وضو کرو۔ اُٹھو میرے بیٹے !" ماں کی آنکھوں میں اب
خوشی کی رم جھم تھی —" تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔ ماں کا حکم ماننا بہت
بڑا ثواب ہے "
پرویز بڑی مشکل کے ساتھ اپنے بستر سے اُٹھا۔ ماں نے ٹھنڈا پانی دیا۔ پرویز
نے وضو کیا اور جائے نماز پر ماں کی ہدایت کے مطابق سجدے میں گر گیا۔ ماں
نے جو کہا تھا۔ وہ بڑبڑاتا رہا۔
ماں بہت خوش تھی۔ اس کا رُواں رُواں اپنے بیٹے کی صحت کے لئے خدا
کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرویز گوشت کی بوری طرح جائے نماز
سے لڑھکتا ہوا فرش پر آگرا۔
ماں نے بڑھ کر پرویز کو سنبھالا دیا تو وہ مر چکا تھا۔
ماں نے دیوانہ وار چیخنا شروع کر دیا۔
"شاہد ! تمہارا بھائی مر گیا ہے۔ تمہارا پرویز مر گیا ہے۔ شاہد۔ کمرے سے
باہر آؤ شاہد۔ دیکھو پرویز نے آنکھیں موند لی ہیں۔"
شاہد نے ماں کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

ماں سرطان کے مریض مر ہی جاتے ہیں۔ صبر کرو۔ میرے لئے تو یہ بہت دیر سے مر چکا تھا۔"

"کیا؟ ماں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پرویز کو پچھلے تین سالوں سے سرطان کی بیماری تھی"۔ شاہد نے کہا۔

"پچھلے تین سالوں یا دو سالوں سے؟" ماں کا کلیجہ جیسے دھک سے رہ گیا ہو۔

"پچھلے تین سالوں سے۔ ڈاکٹروں نے یہی تشخیص کی ہے۔

"لیکن تب تو یہ ——" ماں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان جیسے تو بہ کا پتھر ہو گئی ہو۔"

چھ مختصر کہانیوں کا مجموعہ

گھنٹیاں

از

لیاقت ع ناز

"..... مصنف ..... قاری کو اپنی کہانیوں میں کئی ایک جگہ پر چونکا دیتا ہے .....

..... اس کتاب کی اصل خوبصورتی نوجوان مصنف کی وہ کاوش ہے جس میں اُس نے سستی جذباتیت کا سہارا لئے بغیر قاری میں وہ شعوری صلاحیتیں اُجاگر کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے جن کے بغیر ایک اچھے فنکار کے رموز فن کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"پاکستان ٹائمز"

مختصر کہانیوں کا تیسرا مجموعہ

بھجن

از

لیاقت ع ناز

بھجن اِن کرداروں کی کتاب ہے جو مذہب کی میٹھی اور خواب آور گولیاں نگل کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے ان کا انجام دوزخ ہی ہوگا!،،

دھرتی پر ہی چلتا روندتا دوزخ !